سرخ تیر کی وادی میں

سُرخ تیر: پہلا حصہ

لیشوما اور سُرخ تیر

بچّوں کے لیے ناول

سرخ تیر: تیسرا حصہ

سُرخ تیر کے قیدی

بچّوں کے لیے ناول

سُرخ تیر: دوسرا حصہ

سُرخ تیر کا شکار

بچّوں کے لیے ناول

سرخ تیر: چوتھا حصہ

سُرخ تیر کی وادی میں

بچّوں کے لیے ناول

خاں کی ہدایت پر عمل کیا۔ انھیں اس جگہ بٹھا کر وہ واپس اس جگہ آ گئے جہاں کامران مرزا کو چھوڑا تھا۔ ان کے ساتھ رمضان بھی تھا۔

منوّر علی خاں نے اگلے اِقدام کے بارے میں پوچھا تو کامران مرزا نے بتایا کہ اب انھیں صبح ہونے کا انتظار کرنا ہے۔

"لیکن کس جگہ؟" آفتاب نے اشاروں میں پوچھا۔

"مسٹر جارج کے کمرے کے پاس"

کامران مرزا نے ان سب کو جارج کے کمرے کے پاس برآمدے کے موڑ پر دبک کر بیٹھ جانے کی ہدایت کی اور ایک بار پھر انھیں بتانے لگے کہ وہ کیا کرنا چاہتے ہیں۔

ان کی یہ ترکیب سُن کر منوّر علی خاں اور مزدوروں کی آنکھیں حیرت کے مارے کھُلی کی کھُلی رہ گئیں۔

دراصل الجھن یہ تھی کہ اس پوری زمین دوز دنیا کا کنٹرول اس شخص کے ہاتھ میں تھا جو سُرخ پہاڑیوں میں محفوظ بیٹھا تھا۔ وہ جب چاہے اس دنیا کو تہس نہس کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اس دنیا میں ہونے والی تمام گفتگو بھی سُن سکتا تھا۔ اگر وہ جارج پر قابو پا بھی لیتے اور اس سے تہ خانے سے نکلنے کا راستہ پوچھتے تو وہ شخص سُن لیتا اور اسے معلوم ہو جاتا کہ جارج اور اس کے دوسرے وفادار پکڑے جا چکے ہیں۔

اس صورت میں وہ صرف اتنا کرتا کہ ایک بٹن دبا دیتا اور یہ زمین دوز دنیا ملبے کے ڈھیر میں تبدیل ہو جاتی۔ جارج سے باہر نکلنے کا راستہ معلوم کرنا ناممکن تھا۔ لیکن کامران مرزا کی ترکیب سُن کر انھیں یہ ممکن نظر آنے لگا۔ ان کے دل بلّیوں اچھلنے لگے اور وہ جارج کے باہر نکلنے کا انتظار کرنے لگے۔ ابھی دن نکلنے میں دو گھنٹے باقی تھے۔

انھیں یوں لگا جیسے یہ دو گھنٹے دو سال کے برابر ہوں۔ آخر خدا خدا کر کے ٹھیک سات بجے جارج کے کمرے کا دروازہ کھُلا اور وہ باہر نکلا۔ جوں ہی وہ برآمدے کا موڑ مُڑا کامران مرزا اُس پر اس انداز سے ٹوٹے کہ وہ دنگ رہ گیا۔ انھوں نے اس کی پُشت کی طرف سے حملہ کیا تھا اور دونوں ہاتھ کندھوں پر سے اس کے منھ پر جما دیے تھے۔ ان کے ساتھ ہی منوّر علی خان نے اس کی ٹانگیں جکڑ لیں۔ رمضان نے اُسے درمیان سے تھام لیا۔

آفتاب کے ہاتھ میں رسّی تیار تھی۔ چند منٹ بعد ہی اس کے ہاتھ کمر کے پیچھے باندھے جا چکے تھے، ٹانگیں جکڑی جا چکی تھیں، منھ میں رومال ٹھونس کر اوپر سے کپڑا باندھا جا چکا تھا اور اب وہ ایک گٹھڑی کی صورت میں فرش پر پڑا تھا۔ رمضان اور منوّر علی خان نے مل کر اُسے اٹھا لیا۔ کامران مرزا

کا رُخ اب جارج کے اس کمرے کی طرف تھا جہاں بیٹھ کر وہ سب کو کنٹرول کرتا تھا۔

جارج کے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر کامران مرزا نے دائیں ہاتھ پر لگا ہوا بٹن دبایا۔ دروازہ کھُل گیا۔ سب سے پہلے کامران مرزا ہی اندر داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے دوسرے اندر پہنچے۔ کامران مرزا سیدھے جارج کی کرسی کی طرف گئے اور اس پر بیٹھ گئے۔ منوّر علی خان اور رمضان نے جارج کو فرش پر ڈال دیا۔ اس وقت تک ہر کام بخیر و خوبی انجام پایا تھا۔ لیکن اس موقع پر ان سب کے دل بُری طرح دھک دھک کر رہے تھے۔ کیوں کہ انھیں سینکڑوں میل دور بیٹھے اس شخص کو فریب دینا تھا جو اس قدر دور ہوتے ہوئے بھی بہت خطرناک تھا۔ ان کی ذرا سی غلطی سب کو موت کے منھ میں لے جاتی اور پھر دنیا کو کبھی یہ نہ معلوم ہو سکتا کہ کامران مرزا، ان کے دوست اور بچّوں پر کیا گزری اور وہ کہاں گئے۔ زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔

جارج کی آنکھیں کھُلی تھیں اور ان میں زمانے بھر کی حیرت بھری تھی۔ وہ کامران مرزا کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے وہ اس دنیا کی مخلوق نہ ہوں، کسی دوسری دنیا سے آئے ہوں۔ لیکن ابھی اس کی قسمت میں اور بھی حیران ہونا باقی تھا۔ اس وقت

اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے جب کامران مرزا کے حلق سے آواز نکلی۔

جارج کے کمرے میں اگرچہ کامران مرزا کی آواز اُبھری تھی مگر سننے والے اس قدر دنگ تھے کہ ایسے میں کوئی ان کے جسم میں سوئی بھی چُبھو دیتا تو شاید انھیں پتا نہ چلتا۔ کامران مرزا کے منھ سے نکلنے والی آواز بالکل جارج کی آواز تھی۔ جارج کامران مرزا کے منھ سے نکلنے والی اپنی آواز سُن کر حیرت کے مارے بے ہوش ہونے کے قریب تھا۔ کامران مرزا اس کی آواز کی نقل کرنے میں پوری طرح کامیاب رہے تھے اور سینکڑوں میل دور بیٹھے ہوئے دُشمن کے فرشتے بھی نہیں سوچ سکتے تھے کہ اس کی بنائی زمین دوز دُنیا میں اس کے نائب کے کمرے کی کُرسی پر اس وقت جارج کی بجائے ایک اور شخص بیٹھا اس کے نائب کی آواز میں بول رہا ہے۔ صرف یہی ایک ترکیب تھی جس سے کام لے کر کامران مرزا اس زمین دوز دُنیا میں آواز منھ سے نکال سکتے تھے۔ اُنھوں نے سنا، وہ کہہ رہے تھے:

"ہاں تو کامران مرزا تم ان چیزوں کا پتا بتانے کو تیار ہو یا سُرخ موت مرنا چاہتے ہو؟ اگر تم نہیں بتاؤ گے تو اسی وقت تمھیں، تمھارے دوست اور ان بچّوں کو اس دُنیا

سے باہر لے جاکر سُرخ موت مار دیا جائے گا۔ سوچ لو۔ ان چیزوں کا پتا بتانے کی صورت میں تمھاری زندگی محفوظ رہے گی، البتہ تمھیں اسی زمین دوز دنیا میں ہمارے لیے کام کرنا ہوگا۔ میں تمھارے جواب کا منتظر ہوں۔"

یہ کہہ کر کامران مرزا چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئے۔ اور اب جو ان کے حلق سے آواز نکلی، وہ ان کی اپنی تھی۔ اب وہ کہہ رہے تھے:

"موت کی ہماری نظروں میں کوئی وقعت نہیں۔ تم اپنی سُرخ موت کو آواز دے لو۔ ہم تمھیں ان چیزوں کا پتا کسی صورت بھی نہیں بتائیں گے۔"

"بہت اچھا۔" کامران مرزا نے ایک بار پھر جارج کی آواز میں کہا۔

"اُستاد! ان لوگوں کو لے جاؤ۔ سرخ موت ان کا مقدر ہو چکی ہے۔"

"بہت بہتر، جناب۔" کامران مرزا نے اُستاد کی آواز میں کہا اور منوّر علی خان اور رمضان کو اشارہ کیا کہ جارج کو اٹھا کر باہر لے چلیں۔ ساتھ ہی بچّوں کو بھی باہر جانے کا اشارہ کیا۔

"میں دروازہ کھول رہا ہوں۔" کامران مرزا نے پھر جارج کی آواز میں کہا اور اس کے ساتھ ہی منوّر علی خان اور رمضان

نے جارج کو اٹھا لیا اور کمرے سے باہر نکل گئے۔

آفتاب، آصف اور فرحت حیران تھے کہ کامران مرزا دروازہ کس طرح کھولیں گے!

لیکن وہ کچھ نہیں پوچھ سکتے تھے۔ خاموشی سے کمرے سے نکل گئے۔ اُن کا رُخ سیڑھیوں کی طرف تھا جہاں پہلے ہی اڑھائی سو مزدور دبکے بیٹھے تھے۔ انھوں نے جو جارج کی مُشکیں کسی دیکھیں تو ان کے چہرے کھل اُٹھے، اور قریب تھا کہ ان کے منھ سے خوشی کے مارے آواز نکل جاتی کہ اسی وقت منوّر علی خان نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انھیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

عین اسی وقت گڑگڑاہٹ کی آواز سُنائی دی۔ تہ خانے کا دروازہ کھُل رہا تھا۔

وہ سب بے تحاشا اٹھ کر دروازے کی طرف لپکے۔ بالکل اسی طرح، جیسے کسی پنجرے میں بہت سے پرندے قید کر دیے جائیں اور پھر اچانک ایک چھوٹا سا دروازہ کھول دیا جائے۔

ان میں سے ہر ایک کی خواہش تھی کہ سب سے پہلے وہ نکلے۔ اس گڑبڑ نے منوّر علی خان اور بچّوں کو بوکھلا دیا، مگر اب وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ قیدیوں کو ایک منٹ کے لیے

بھی روکنا اب ان کے بس سے باہر تھا۔

دوسری طرف نیچے حیران تھے کہ کامران مرزا اتنی جلد دروازہ کھولنے میں کامیاب کیسے ہو گئے۔ اسی وقت انھوں نے اپنے پیچھے قدموں کی آواز سنی۔ انھوں نے مڑ کر دیکھا۔ کامران مرزا تیزی سے ان کی طرف آ رہے تھے۔

پروفیسر جیلانی

سیکرٹری صاحب بے چینی کے عالم میں اپنے کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ ان کی میز پر ٹیلیفون رکھا تھا۔ وزیر داخلہ اس وقت کوئی اٹھارہ مرتبہ فون کر کے معلوم کر چکے تھے کہ کامران مرزا اور ان کے ساتھیوں کا کوئی پتا چلا، یا نہیں۔ انھوں نے ہر بار انکار میں جواب دیا تھا۔ دوسری طرف ان کے ماتحت شہر کا چپا چپا چھانتے پھر رہے تھے۔ بار بار وہ انھیں فون پر اپنی کار گزاری کی رپورٹ دے رہے تھے، لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ انھوں نے ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی تھی۔

اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ وہ یہ سوچتے ہوئے کہ ضرور وزیر داخلہ اُنیسویں مرتبہ فون کر رہے ہیں، تیزی سے میز کی طرف لپکے۔ پھر جوں ہی انھوں نے ریسیور اٹھایا، ان کی آنکھیں پھٹی پھٹی رہ گئیں۔ دوسری طرف سے آنے والی آواز کامران مرزا کے سوا کسی کی نہیں تھی۔ وہ کہہ رہے تھے:

"میں شہر سے ایک سو بیس میل کے فاصلے پر شمالی سڑک پر موجود ہوں۔ میرے ساتھ اڑھائی سو قیدی بھی ہیں اور میں انھیں تین کاروں میں سوار کر کے نہیں لا سکتا، لہٰذا فوراً ٹرک اور جیپیں لے کر یہاں پہنچیے۔ باقی حالات یہاں آنے پر بتاؤں گا۔"

"اُف میرے خدا! کامران مرزا! یہ تم ہو؟ ہم نے تمھیں کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا۔ خیر، یہ باتیں تو پھر بھی ہوتی رہیں گی۔ میں آ رہا ہوں۔ تم بے فکر رہو۔"

یہ کہہ کر انھوں نے جلدی سے سلسلہ بند کیا اور وزیرِ داخلہ کے نمبر ڈائل کر کے انھیں یہ نئی اطلاع دی۔ وہ پُرجوش آواز میں بولے:

"میں بھی تمھارے ساتھ چل رہا ہوں۔"

کھنڈر نما عمارت سے باہر نکل کر وہ سب چلّانے لگے تھے۔ ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ حلق پھاڑ پھاڑ کر ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہے تھے۔ اچانک کامران مرزا نے خاموش ہونے کے لیے کہا۔ جب سب چپ ہو گئے تو انھوں نے کہا:

"ہم ابھی خطرے سے باہر نہیں ہیں۔ یہ عمارت کسی وقت

بھی پھٹ سکتی ہے، اور اس کا ملبہ ہم پر آ گرے گا۔ اس لیے سب سے پہلے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سب اس جنگل سے نکل کر سڑک تک پہنچ جائیں۔ ہم آگے آگے چلتے ہیں۔ تم سب پیچھے آؤ۔ اگر اس وقت عقل اور ہوش سے کام نہ لو گے تو ہم میں سے نہ جانے کتنے جنگل میں بھٹک کر رہ جائیں گے۔ میں تم لوگوں سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تم نے میری ہدایات پر عمل کیا تو تم سب کو تمھارے گھروں تک پہنچا کر دم لوں گا۔ اس سے پہلے میں کچھ کھاؤں گا، نہ پیوں گا اور نہ اپنے گھر جاؤں گا۔"

وہ سب خاموش ہو گئے۔ جنگل میں اب دن کی روشنی پھیل چکی تھی۔ منوّر علی خان کو اس جگہ تک پہنچنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی جہاں کاریں کھڑی کی گئی تھیں۔ یہاں سے انھیں وہ راستہ بھی نظر آ گیا جس پر چل کر وہ جنگل سے باہر نکل سکتے تھے۔ ایک جگہ انھیں بہت سی بلیاں مری پڑی نظر آئیں۔ کامران مرزا نے اپنی کار سنبھالی، منوّر علی خان نے دوسری اور سب انسپکٹر رمضان نے تیسری۔ بچے کامران مرزا کے ساتھ بیٹھ گئے۔ تین کاروں کے پیچھے مزدوروں کا قافلہ روانہ ہوا اور اس طرح یہ لوگ تقریباً ایک گھنٹا چلنے کے بعد سڑک پر آ گئے۔ یہاں پہنچ کر کامران مرزا نے سڑک کا بغور

جائزہ لیا اور بولے:

"جہاں تک میرا خیال ہے، یہ شمالی سڑک ہی ہے، اور ہم شاید اپنے ملک میں ہی موجود ہیں۔ خیر، میری کار میں ٹیلی فون موجود ہے۔ میں ابھی فون کرتا ہوں۔ انشاءاللہ دو تین گھنٹوں تک مدد پہنچ جائے گی۔"

یہ کہہ کر انھوں نے کار کا ایک خفیہ خانہ کھولا اور اس میں سے فون نکال کر سیکرٹری کے نمبر ڈائل کرنے لگے یہ دیکھ کر ڈھائی سو لوگوں کی باچھیں کھل گئیں۔ اب انھیں اپنے گھروں تک پہنچنا ممکن نظر آنے لگا۔ کامران مرزا فون کر کے فارغ ہی ہوئے تھے کہ ایک زبردست دھماکا ہوا۔ اتنا زبردست کہ زمین ہل گئی۔ انھیں یوں لگا جیسے کوئی آتش فشاں پہاڑ پھٹا ہو اور پھر انھوں نے دیکھا، جنگل کے بیچوں بیچ گرد و غبار کا ایک طوفان سا اُمڈا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورے جنگل کو دھول نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

"تباہ کر دیا! اس نے اپنے اس اڈّے کو ملبے کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا۔" کامران مرزا بڑبڑائے۔

ٹھیک دو گھنٹے کے بعد سیکرٹری صاحب وزیر داخلہ

سمیت ٹرک اور جیپیں لے کر وہاں پہنچ گئے اور سب حالات سن کر ہکّا بکّا رہ گئے۔ پھر انھوں نے جنگل میں جا کر اس جگہ کا معائنہ کیا، مگر اب وہاں کیا رکھا تھا۔ سوائے ملبے کے کچھ نظر نہ آیا۔

آخر واپسی کی ٹھہری۔ کامران مرزا نے جو کہا تھا، کر دکھایا۔ انھوں نے سب لوگوں کو ان کے گھروں تک پہنچا دیا۔ اس روز انھوں نے خوب دعائیں سمیٹیں۔ ہزاروں لوگوں کے دل خوش کیے۔ جارج اور اس کے پچاس وفاداروں کو جیل میں ٹھونس دیا گیا۔ سیکرٹری صاحب نے جب کامران مرزا سے پوچھا کہ اب ان کا کیا پروگرام ہے، تو انھوں نے سب کے سامنے کہا:

"ابھی دشمن کا صرف ایک قلعہ فتح ہوا ہے۔ اصل مرحلہ باقی ہے۔"

ان کے یہ الفاظ دوسرے دن کے اخبارات نے نمایاں جگہوں پر شائع کیے۔ پورے ملک میں پہلے ہی سنسنی پھیل ہوئی تھی۔ لیشوبا کچھ بتائے بغیر ہی مر گیا تھا۔ ایسے حالات میں سُرنج موت کی وادی کے راستے کا پتا چلانا ہی ناممکن تھا، وہاں پہنچ کر دشمن کا مقابلہ کرنا تو دُور کی بات تھی۔

کامران مرزا نے سب سے پہلے پروفیسر جیلانی سے ملنے کا فیصلہ کیا - ان کا خیال تھا کہ ان سے ضرور مدد مل سکتی ہے -

دوسرے دن شام کے وقت وہ بچوں سمیت اُن کی کوٹھی کے دروازے پر پہنچ گئے - کامران مرزا نے اپنا کارڈ اندر بھجوایا تو ملازم نے آکر بتایا کہ پروفیسر کسی سے ملنے کے لیے تیار نہیں - وہ ابھی ابھی سرحدی شہر والی رصدگاہ سے آئے ہیں -"

کامران مرزا کو پہلے ہی اس قسم کے جواب کی توقّع تھی - وہ فکرمند ہو گئے - کسی سے سفارش بھی نہیں کرا سکتے تھے آخر انھوں نے کاغذ کے ایک پرزے پر کچھ لکھا اور ملازم کو دے کر کہا :

"ٹھیک ہے - اگر وہ ملنا پسند نہیں کرتے تو نہ سہی - مگر تم یہ کاغذ کا پرزہ تو ان تک پہنچا دو -"

ملازم نے پرزہ لیا اور اندر چلا گیا - تینوں بچے حیران تھے کہ انھوں نے کاغذ پر کیا لکھا ہے - کامران مرزا نے انھیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا - وہ منوّر علی خاں کو بھی ساتھ نہیں لائے تھے - کیوں کہ وہ پروفیسر جیلانی کی عادت سے خوب واقف تھے - وہ فوراً اعتراض کر دیتے کہ ایک

سرکاری معاملے میں غیر سرکاری آدمی کو کیوں ساتھ لایا گیا ہے - انھیں معلوم تھا کہ وہ بچوں پر بھی اعتراض کریں گے لیکن کامران مرزا نے اس کا جواب پہلے سے سوچ لیا تھا -

ملازم کے واپس آنے میں دیر نہ لگی - اس نے آتے ہی کہا :

"صاحب آپ سے ملنے کے لیے تیار ہیں - آئیے -"

ملازم نے انھیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا اور خود باہر چلا گیا - جلد ہی انھوں نے قدموں کی چاپ سنی - وہ پروفیسر کو دیکھ کر حیران رہ گئے - ان کا قد ساڑھے چھ فٹ کے قریب تھا اور تھے بھی بہت بھاری بھرکم - یوں لگتا تھا جیسے کوئی گنبد چلا آرہا ہے - ان کے چہرے پر غصّے کے آثار تھے - آنکھیں خون اُگل رہی تھیں - ہونٹ بار بار پھڑک رہے تھے - وہ آتے ہی چنگھاڑتی ہوئی آواز میں کہنے لگے :

"جو لوگ میرا وقت ضائع کرتے ہیں، وہ ملک و قوم کے دشمن ہیں - میں تم سے ملنے سے انکار کر چکا تھا، اس کے بعد بھی تم باز نہیں آئے اور مجھے یہ لکھ بھیجا کہ اگر مجھ میں وطن پرستی کا کوئی جذبہ موجود ہے تو وطن کے نام پر ملاقات کروں - کیا تم سمجھتے ہو کہ وطن سے تم جیسوں کو محبّت ہے؟ وطن کے لیے ایجادیں ہم کریں اور وطن پرست کہلائیں

تم جیسے۔ بہرحال، میں تمھیں ایک منٹ دے سکتا ہوں۔ ایک منٹ کے اندر اندر بتاؤ کیا چاہتے ہو۔ آیندہ میں تمھاری شکل اس گھر میں نہ دیکھوں۔"

آفتاب، آصف اور فرحت کا مارے غُصّے کے بُرا حال تھا۔ ان کا جی چاہ رہا تھا کہ پروفیسر جیلانی پر ٹُوٹ پڑیں اور اس کی بوٹیاں نوچ لیں۔ لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے کہ کامران مرزا اس وقت بھی مسکرا رہے تھے۔ اچانک وہ پُرسکون اور ٹھہری ہوئی آواز میں بولے

"پروفیسر صاحب، میں یہاں یہ بتانے نہیں آیا کہ میں کیا ہوں اور کون ہوں۔ اگر سوال ملک کی سلامتی کا نہ ہوتا تو میں ہرگز آپ کا وقت ضائع نہ کرتا۔ بہرحال، میں آپ کی خدمت میں نہایت ادب سے یہ کارڈ پیش کرتا ہوں۔ اس کی رُو سے آپ مجھے وقت دینے پر مجبور ہیں اور جس کام کی غرض سے میں آیا ہوں، وہ بھی کرنے کے پابند ہیں۔"

"کیا...!!" پروفیسر حلق پھاڑ کر پوری طاقت سے چلّایا۔ "یہ تم نے کیا بکواس کی ہے؟ میں تمھیں یہیں شوٹ کر دوں گا۔"

یہ کہتے ہی اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے پستول نکال لیا۔

کامران مرزا نے ان کے پستول کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ وہ تو جیب سے کارڈ نکال رہے تھے۔ انھوں نے صرف اتنا کہا: "مجھے گولی ضرور مار دیں۔ لیکن اس کارڈ پر ایک نظر ڈالنے کے بعد۔"

جوں ہی کارڈ پر پروفیسر جیلانی کی نظر پڑی، وہ اپنی جگہ ساکت رہ گئے۔ پستول والا ہاتھ نیچے لٹک گیا۔ یہ کارڈ کامران مرزا کو ان کی خدمات کے صلے میں وزیراعظم نے دیا تھا۔ اس کی رُو سے وہ ملک کے کسی بھی معاملے میں دخل دے سکتے تھے اور ملک کے کسی بھی باشندے سے مدد لے سکتے تھے۔ مدد دینے سے انکار کرنے والا مُجرم ٹھہرایا جا سکتا تھا اور اسے سزا دی جا سکتی تھی۔

انھوں نے دیکھا، پروفیسر جیلانی کا غُصّہ صابن کے جھاگ کی مانند ختم ہو گیا تھا۔ انھوں نے صرف اتنا کہا:

"ٹھیک ہے۔ کام بتاؤ... مگر یہ بچّے تمھارے ساتھ کیوں ہیں؟"

"یہ بھی اس معاملے میں اُلجھے ہوئے ہیں، بلکہ یہی آدمی سب سے پہلے انھی سے ٹکرایا تھا۔"

"خیر، بات بتاؤ۔"

کامران مرزا نے پوری تفصیل سے اُنھیں سارا قصہ بتاتے

اور آخر میں سنہری ڈبیاں، شیشیاں اور تیر نکال کر ان کے سامنے رکھ دیے۔

"میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یہ چیزیں کیا بلا ہیں؟ ان کا استعمال کیا ہے؟"

"ٹھیک ہے۔ کل مجھے فون کر لینا۔ میں تمھیں بتا دوں گا۔"

"شکریہ۔ لیکن اتنا یاد رکھیے گا کہ یہ مسئلہ ملک کی سلامتی کا ہے۔"

"ہاں ہاں۔ میں اچھی طرح جان گیا ہوں۔ اب تم جا سکتے ہو۔" وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

دوسرے دن فون پر پروفیسر جیلانی نے بتایا کہ وہ ان چیزوں کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں کر سکے۔

کامران مرزا کو یہ سن کر بہت غصہ آیا۔ انھوں نے اپنے ایک ماتحت کو بھیج کر چیزیں واپس منگوا لیں۔ پھر سکرٹری صاحب اور وزیر داخلہ کو فون کیا کہ پروفیسر جیلانی سے کوئی مدد نہیں مل سکی۔ اب خدا جانے وہ جان بوجھ کر کچھ نہیں بتا رہے ہیں یا

واقعی وہ ان چیزوں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کر سکے۔

"پھر؟ اب آپ کیا کریں گے؟" وزیر داخلہ نے فکرمند ہو کر کہا۔

"آپ فکر نہ کریں۔ میں بہت جلد آپ کو کوئی نئی خبر سناؤں گا۔" کامران مرزا نے کہا۔

سُرخ وادی کا راستہ

پھر ہوا یہ کہ اڑھائی سو مزدوروں میں سے کسی ایک کے منھ سے نکلی ہوئی بات ہوتے ہوتے ایک اخباری نُمایندے کے کانوں تک پہنچ گئی۔ بس پھر کیا تھا۔ اس نے نمک مرچ لگا کر اخبار میں اسے شائع کر دیا۔ پھر تو ہر طرف شور مچ گیا۔ حکومت پر کیچڑ اُچھالی جانے لگی۔ کامران مرزا اور ان کے بچّوں کی تعریفوں کے پُل باندھے گئے۔

بڑے افسروں کا جب ناک میں دم آگیا تو کامران مرزا پر دباؤ ڈالا جانے لگا کہ اس سلسلے میں جلد کوئی قدم اٹھائیں تاکہ لوگوں کی پریشانی اور خوف دور ہو۔ ہر کوئی اس خیال سے خوف زدہ ہو گیا تھا کہ نہ جانے وہ کس قسم کا خطرہ ہے جس کی طرف لیشوما اشارہ کرنے والا تھا۔ زمین دوز دُنیا میں جو چیزیں تیار ہوتی تھیں، ان کی کہانی تو بچّے بچّے کی زبان پر تھی، اور اب عام خیال یہ کیا جانے لگا تھا

کہ کسی دن گیسی پستولوں والے ان پر ٹوٹ پڑیں گے۔

کامران مرزا پر ان دنوں سوچ کا بھوت سوار تھا۔ وہ اپنے کمرے میں میز پر ان چیزوں کو رکھے گھنٹوں گھورتے رہتے۔ بچّے اور منوّر علی خاں انھیں ٹکر ٹکر دیکھتے رہتے۔ بہت دنوں سے نہ کوئی شطرنج کی بازی جمی تھی اور نہ کیرم کھیلا گیا تھا۔ تینوں بچّے سخت بیزاری محسوس کر رہے تھے۔

اچانک ایک دن کامران مرزا نے خود کو کمرے میں بند کر لیا۔ بچّوں اور منوّر علی خاں نے اندر جانے کے لیے دروازے پر دستک دی تو ان کی آواز آئی "ایک گھنٹے سے پہلے کوئی مجھے بلانے کی کوشش نہ کرے۔"

وہ بہت حیران ہوئے۔ پورا ایک گھنٹا انتظار کرنے کے بعد کہیں جا کر دروازہ کھلا۔ کامران مرزا کے چہرے پر جوش کے آثار تھے۔ کمرے کے فرش پر سینکڑوں سائنسی رسالے بکھرے پڑے تھے۔ صرف ایک رسالہ میز پر رکھا تھا۔ جوں ہی وہ اندر داخل ہوئے، کامران مرزا چلّائے "میں نے سُرخ موت کی وادی کا راستہ معلوم کر لیا ہے۔"

اُن کے منھ حیرت کے مارے کھُلے کے کھُلے رہ گئے وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کامران مرزا کمرے کے اندر

بند ہو کر بھی سُرخ موت کی وادی کا راستہ تلاش کر سکتے ہیں۔

"آخر کیسے؟ تم کیسے راستہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئے؟" منوّر علی خاں نے کہا۔

"میرے ذہن میں کئی دنوں سے کھچڑی سی پک رہی تھی۔ کوئی بات رہ رہ کر ذہن میں آتی تھی اور نکل جاتی تھی۔ آخر مجھے یہ بات یاد آ ہی گئی کہ سالوں پہلے میں نے کسی سائنسی رسالے میں اس قسم کی وادی کا ذکر پڑھا تھا۔ میں رسالہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں اور اس مضمون کو پڑھنے کے بعد اب یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ وہی وادی ہے جسے جارج اور اس کے ساتھی سُرخ تیر کی وادی کہتے ہیں۔"

"حیرت ہے! آپ نے اس قدر آسانی سے پتا لگا لیا۔ لیکن وہ کون ہے جس نے یہ مضمون لکھا تھا؟ کیا وہ اس وادی کی سیر کر چکا ہے؟" آفتاب نے پوچھا۔

"اگر میں تم لوگوں کو یہ بتا دوں کہ مضمون لکھنے والے کا نام کیا ہے تو شاید تم اپنی جگہ سے اُچھل پڑو گے۔" کامران مرزا مسکرائے۔

"اوہ! تو کیا وہی شخص اصل مجرم ہے، جس نے یہ مضمون لکھا تھا؟"

"یہ نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ مضمون اس نے آج سے پندرہ سال پہلے کبھی لکھا تھا۔ اب خدا جانے وہی مجرم ہے یا اس کا مضمون پڑھ کر اس کی معلومات سے کسی اور نے فائدہ اُٹھایا ہے۔"

"آخر وہ کون ہے؟ جس نے یہ مضمون لکھا ہے؟" آصف نے جلدی سے کہا۔

"اگر تم سُننا ہی چاہتے ہو تو بتائے دیتا ہوں۔ بلکہ کیوں نہ ہم اسی وقت اس کے پاس چلیں۔ جب تم اس کے سامنے پہنچو گے تو خود ہی دیکھ لو گے کہ وہ کون ہے۔"

"تو پھر چلیے۔ ہم فوراً جاننا چاہتے ہیں۔" آفتاب بولا

وہ گھر سے نکل کر ٹیکسی میں بیٹھے۔

"گرینڈ روڈ چلو۔" کامران مرزا نے ڈرائیور سے کہا۔

گرینڈ روڈ پر اتر کر وہ سب پیدل چلنے لگے۔ پھر ایک چھوٹی سی سڑک پر مڑ کر دوسری سڑک پر آئے۔ انھوں نے دیکھا، وہ پروفیسر جیلانی کی کوٹھی کے سامنے کھڑے ہیں۔ ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"تو کیا وہ مضمون پروفیسر جیلانی نے لکھا تھا؟" منوّر علی خاں نے حیرت زدہ لہجے میں کہا:

"ہاں۔ ایک ہوائی سفر کے دوران میں ان کے جہاز

میں آگ لگ گئی تھی، لیکن وہ زندہ بچ گئے اور اس وادی میں اتر سکنے میں کامیاب ہو گئے۔ انھوں نے اس وادی میں جو کچھ دیکھا، وہی اس مضمون میں لکھا تھا۔"

"اوہ! تو یہ بات ہے۔" آصف کے منھ سے نکلا۔

کامران مرزا گھنٹی بجا چکے تھے۔ ملازم نے دروازہ کھولا تو انھوں نے اپنا کارڈ اسے دے کر اندر بھیج دیا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر کے اس مضمون کو کسی ملک کے سائنس دان نے پڑھ لیا ہوگا اور اس نے اپنی سرگرمیوں کے لیے اس جگہ کو چن لیا ہو گا، یہ سوچ کر کہ اس جگہ بیٹھ کر وہ ہر طرح سے محفوظ رہے گا۔"

اور ہو سکتا ہے کہ اس کی سرگرمیوں کے پیچھے اس کے اپنے ملک کا ہاتھ بھی ہو۔" آفتاب نے خیال ظاہر کیا۔

"بالکل۔ یہ تو یقینی بات ہے۔ اس قسم کے ملبے واڑے پروگرام حکومت کی مرضی کے بغیر نہیں بنائے جاتے۔" منور علی خاں بولے۔

"اگر یہ بات ہے تو... میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ..." فرحت نے کہا اور خاموش ہو گئی۔

"کیا یقین سے کہہ سکتی ہو؟" آصف نے پوچھا۔

"یہی کہ پروفیسر جیلانی نے جھوٹ کہا تھا کہ ان چیزوں کے بارے میں وہ کچھ معلوم نہیں کر سکے۔ میرا خیال ہے وہ انھیں دیکھتے ہی سمجھ گئے ہوں گے۔"

"بالکل یہی بات ہے۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ انھیں جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟" آفتاب نے کہا۔

"ہو سکتا ہے وہ بھی دشمن ملک کا جاسوس ہو۔" فرحت نے خیال ظاہر کیا۔

"ایسی بات منھ سے نہ نکالو۔ اس وقت پروفیسر جیلانی کی بہت طاقت ہے۔ اگر یہ الفاظ اس کے کانوں میں پڑ گئے تو وہ بہت بری طرح پیش آئے گا۔" منور علی خاں نے کہا۔

"پہلے بھی وہ کب اچھی طرح پیش آیا تھا۔" فرحت بولی۔ "یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ دشمنوں کے خوف سے کچھ نہ بتا سکا ہو۔ ہو سکتا ہے، وہ اس سے واقف ہو۔"

اتنے میں دروازہ کھلا اور ملازم تقریباً دوڑتا ہوا ان کی طرف آیا۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"کیا ہوا؟ خیر تو ہے؟" کامران مرزا بولے۔

"وہ ... وہ ... پروفیسر صاحب۔"

"کیا ہوا پروفیسر صاحب کو ؟"

"وہ ... وہ ..." اس کے منھ سے اس سے زیادہ کوئی لفظ نہ نکل سکا۔

کامران مرزا اندر گھس گئے۔ دوسرے ان کے پیچھے دوڑے۔ ملازم بھی ان کے ساتھ اندر آیا۔ وہ انھیں لے کر پروفیسر جیلانی کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ دھک سے رہ گئے۔

پروفیسر جیلانی اپنے بستر پر چت لیٹے تھے اور ان کے سینے میں سُرخ تیر گھسا ہوا تھا۔ ان کی بے نُور آنکھیں چھت کو گھُور رہی تھیں۔

کامران مرزا نے جلدی سے آگے بڑھ کر پروفیسر کی نبض ٹٹولی، دل پر کان رکھ کر دیکھا لیکن زندگی کے کوئی آثار نظر نہ آئے۔ وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولے:

"یہ ختم ہو گئے، دشمن نے انھیں عین موقع پر ہلاک کر دیا، جس طرح لیشوما کو کچھ بتانے سے پہلے ہلاک کر دیا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ ضرور کچھ جانتے تھے بلکہ بہت کچھ جانتے تھے۔"

وہ ملازم کو دروازہ بند کر دینے کی ہدایت کر کے باہر نکل آئے۔ پروفیسر اس دنیا میں تنہا تھے۔ ان کے

نہ بیوی بچے تھے، نہ کوئی رشتے دار۔ پوری کوٹھی بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔

کامران مرزا نے سیکرٹری صاحب اور وزیرِ داخلہ کو اس نئی صورتِ حال سے آگاہ کیا اور پروفیسر جیلانی کے کفن دفن کا بندوبست کرنے کے لیے کہا۔

"ہم ایک بار پھر اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارتے رہ گئے۔" منوّر علی خاں بولے۔

"نہیں۔ اب وہ مجھے سُرخ وادی میں جانے سے نہیں روک سکتے۔ وہ راستے میں جتنی جی چاہے رکاوٹیں کھڑی کر لیں، میں ان سے ضرور ٹکراؤں گا۔"

"ارے!" اچانک آفتاب کے منھ سے نکلا

"کیا ہوا ؟ کیا تمھیں پروفیسر جیلانی کی رُوح نظر آ گئی؟" فرحت نے کہا۔

وہ جیپ میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ پروفیسر کے گھر سے شہر آ کر انھوں نے فون کیا تھا اور اس کے بعد اب اپنے گھر جا رہے تھے۔

"اس کا مطلب ہے ... اس کا مطلب ہے ...." آفتاب سوچ میں کھو کر رہ گیا۔

"یہ کیا بات ہوئی ؟ کس کا کیا مطلب ہے ؟ بھلے

آدمی، جملہ تو پورا بولا کرو۔ کیوں معمّوں میں باتیں کرتے ہو؟ آصف نے کہا۔

"ہمارا خیال یہی تھا کہ جارج اور اس کے ساتھیوں کے علاوہ اس شہر میں سُرخ تیر کی وادی کے کرتا دھرتا کا کوئی آدمی نہیں رہ گیا ہے۔"

"ہاں۔ بالکل۔ یہی بات ہے۔"

"تو پھر پروفیسر جیلانی کو کس نے مارا؟ کیا ان کا کوئی اور ساتھی شہر میں موجود ہے؟" آفتاب نے کہا۔

"اوہ!" کامران مرزا چونکے "واقعی، یہ بات تو مجھے بھی نہیں سوجھی۔ ضرور کوئی اور بھی یہاں موجود ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ سُرخ موت کی وادی کے راستے میں بھی روڑے اٹکائے گا۔" منوّر علی خاں بولے۔

"کوئی پروا نہیں۔ میں اس سے نپٹ لوں گا۔ آفتاب، تم گھر پہنچتے ہی ایک کام کرنا۔ فضلو نے جو بلّی کے بچّے پال رکھے ہیں نا، ان میں سے دو میرے کمرے میں پہنچا دینا۔"

"جی؟ بلّی کے بچّے؟" آفتاب نے حیران ہوکر کہا۔

"ہاں، بلّی کے بچّے۔"

وہ سب سوچتے ہی رہ گئے کہ کامران مرزا بلّی کے بچّوں کا کیا کریں گے!

فائر کرو

کامران مرزا ایک گھنٹے سے بلّی کے بچّوں کے ساتھ اپنے کمرے میں بند تھے۔ منوّر علی خاں اور تینوں بچّے بے چینی سے برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ وہ سوچ سوچ کر تھک چکے تھے کہ آخر وہ کون سا تجربہ ہے جو کامران مرزا کر رہے ہیں تو اچانک کمرے کے اندر سے ایک بلّی کے بچّے کی گھٹی گھٹی چیخ اُبھری۔ وہ چونک اُٹھے۔

"یہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بلّی کے بچّے کے حلق سے آخری آواز نکلی ہو۔"

"ہاں۔ شاید انکل نے بلّی کے بچّے کو مار دیا۔" فرحت نے خیال ظاہر کیا۔

"یہ غلط ہے۔ انھوں نے آج تک کسی چیونٹی کو بھی نہیں مارا۔" آفتاب بولا۔

"تو پھر یہ آواز تمھاری حلق سے نکلی ہو گی۔" آصف نے جل کر کہا۔

"میرے اندر بلّی کی رُوح حلُول نہیں کر گئی کہ میں ایسی آواز میں چلاؤں گا۔"

"اچھا، دماغ نہ خراب کرو۔" آصف جھلّا کر بولا۔

"جو چیز پہلے ہی خراب ہو اسے خراب کرنے کی مجھے کیا ضرورت ہے۔"

"دیکھو۔ میرے دماغ پر کیچڑ اُچھالی تو بُری طرح پیش آؤں گا۔" آصف نے تلملا کر کہا۔

"اس پختہ مکان میں کیچڑ کہاں سے آ گئی؟ اور تم اچھی طرح مجھ سے کب پیش آتے ہو۔ ہمیشہ ہی بُری طرح پیش آتے ہو۔ کیوں کہ اچھی طرح پیش آنے کا طریقہ تو تمھیں آتا ہی نہیں، ویسے فرحت ضرور، اس معاملے میں پیش پیش ہے۔"

منوّر علی خاں کی ہنسی نکل گئی "دھت تیرے کی۔ کر ڈالی پیش کی گردن۔"

منوّر علی خان کی ہنسی درمیان میں ہی رہ گئی۔ کمرے کے دروازے کی چٹخنی گرنے کی آواز ان کے کانوں میں آئی تھی۔ کامران مرزا دروازے میں کھڑے مسکرا رہے تھے۔ پھر انھوں نے چاروں کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔

وہ بے تابی سے اندر داخل ہونے اور حیران رہ گئے۔

کمرے کے فرش پر ایک بلی کا بچہ اِدھر اُدھر دوڑتا پھر رہا تھا، لیکن دوسرا بچہ فرش پر سُکڑا پڑا تھا۔

"ارے! یہ کیا!" آفتاب نے حیران ہو کر کہا۔

"کیا کیا جائے بیٹا۔ انسان کی بھلائی کے لیے بعض اوقات ایسا کرنا پڑ ہی جاتا ہے۔ یہ تجربہ بہت ضروری تھا۔"

"آخر یہ کیسا تجربہ تھا!" آفتاب نے کہا اور پھر وہ چونک اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی منور علی خاں، آصف اور آفتاب بھی چونکے تھے۔ میز پر گیس پستول اور ایک شیشی رکھی تھی، ان شیشیوں میں سے ایک جو نمبر نو کے ساتھیوں کی تلاشی لینے پر ملی تھیں۔

"ارے یہ کیا!" آفتاب کے منہ سے نکلا۔

"میں نے ان بچوں پر گیس پستول سے فائر کیا تھا۔" کامران مرزا نے مسکرا کر کہا۔

"کیا!!!"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔"

"لیکن ... یہ کیسے زندہ رہ گیا؟" آصف نے سوال کیا۔

"اس سے بھی عجیب بات یہ ہے کہ آپ کو بھی کچھ نہیں ہوا!" آفتاب بولا۔

"یہ پستول لو اور مجھ پر فائر کرو۔" کامران مرزا کہا۔

"جی؟ کیا مطلب؟" آفتاب نے کہا۔

"بھئی آخر یہ چکر کیا ہے؟ پوری بات بھی تو بتاؤ نا!" منوّر علی خاں نے کہا۔

"پہلے مجھ پر فائر کرو۔" کامران مرزا بولے۔

"ابا جان، ہو سکتا ہے آپ نے کوئی تدبیر کر لی ہو۔ آپ گیس پستول سے بچ جائیں۔ لیکن ہم کیسے بچ سکتے ہیں؟" آفتاب نے کہا۔

"بیٹا، میرا دماغ صحیح سلامت ہے اور مجھے تمھاری زندگی اپنی زندگی سے زیادہ عزیز ہے۔ جو کہہ رہا ہوں وہ کرو۔"

کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ آفتاب کا پستول والا ہاتھ کانپنے لگا۔ وہ باپ کا حکم ماننے پر مجبور تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے پستول چلا دیا۔

پستول میں سے دھوئیں کی ایک پتلی سی لکیر تیر کی طرح نکلی اور کامران مرزا کی طرف گئی۔ ایک لمحے کے لیے کامران مرزا کا چہرہ دھوئیں میں چھپ کر رہ گیا۔ پھر یہ دھواں پورے کمرے میں پھیل گیا۔ گیس نے ان کا بال بھی بیکا نہ کیا تھا۔ وہ سب صحیح سلامت کھڑے

تھے۔ بلّی کا بچّہ بھی کھیل کود میں مصروف تھا۔ البتّہ دوسرا بچّہ مردہ پڑا تھا۔

سب کا حیرت کے مارے بُرا حال تھا۔ وہ بُت بنے کامران مرزا کو دیکھے جا رہے تھے اور سوچ رہے تھے، اگر کامران مرزا نے کوئی تجربہ کیا ہے تو اس تجربے کے نتیجے میں بلّی کے ایک بچّے اور ان کے بچ جانے کا تو سوال پیدا ہو سکتا ہے، لیکن آخر ہم کس طرح بچ گئے؟

"تو کیا جارج اور اس کے ساتھی جھوٹ بولتے رہے تھے؟" آصف کی آواز نے انھیں چونکا دیا۔

"کیا مطلب؟ یہ تم نے کیسے سمجھا؟"

"اس گیس نے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔"

"بلّی کے اس مُردہ بچّے کو کیوں بھولتے ہو؟ کیا یہ نہیں مرا؟"

"پھر ہم کس طرح بچ گئے؟" آفتاب بولا۔

"میرے تجربے کی وجہ سے۔ اب ہم سب ان گیس پستولوں سے اسی طرح محفوظ ہیں جس طرح جارج اور اس کے ساتھی محفوظ تھے۔" کامران مرزا نے بتایا۔

"آخر کس طرح؟ آپ نے کیا تجربہ کیا تھا؟"

"میں نے بہت سوچا، ان شیشوں کے بارے میں

بھی اور ان سنہری ڈبیوں کے بارے میں بھی۔ ان سنہری ڈبیوں میں تو کوئی چیز نہیں ہے۔ نہ میں انھیں کھول سکا ہوں۔ البتّہ ان شیشیوں میں جو زرد رنگ کا سیّال ہے اس کو نکال کر دیکھا جا سکتا تھا۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ پہلے تو میں نے اُسے سُونگھا۔ اس میں سے تیز بو آرہی تھی۔ لیکن میں یہ نہ جان سکا کہ یہ کس چیز کی بُو تھی۔

"سوچ سوچ کر اچانک میرے ذہن میں ایک سوال گونجا۔ سوال یہ تھا کہ آخر جارج کے آدمی کس طرح گیس پستولوں سے محفوظ رہتے ہیں؟ اس کے ساتھ ہی میری نظر ان شیشیوں پر پڑی، اور اس طرح میں نے ایک تجربہ کیا۔" کامران مرزا یہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔

"اور وہ تجربہ کیا تھا؟"

"میں نے ان بلّی کے بچّوں میں سے ایک کے جسم پر اس سیّال کی مالش کر دی۔" کامران مرزا نے کہا۔

"کیا۔؟"

"ہاں اور جس کے جسم پر مالش کی تھی، وہ فائر کے بعد زندہ رہا، جب کہ دوسرا آناً فاناً مر گیا۔"

"تو... پھر... آپ کو اور ہمیں کیوں کچھ نہیں ہوا؟" آفتاب نے پوچھا۔

"اس لیے کہ میں نے اپنے اور تم سب کے جسموں پر بھی اس تیل کی مالش کر دی تھی۔"

"کیا؟ مالش کر دی تھی؟، مگر کب؟" منوّر علی خاں نے کہا۔

"رات کے وقت، جب تم سو رہے تھے۔ اس سیّال کے دو قطرے پیشانی پر آہستہ سے مل دینا ہی کافی ہوتا ہے۔"

"اوہ!"

غائب!

"اب آپ کو سُرخ موت کی وادی کا راستہ بھی معلوم ہو چکا ہے اور گیس پستولوں سے محفوظ رہنے کا راز بھی۔ تو کیا اب ہم سُرخ موت کی وادی میں جائیں گے؟" آصف نے پوچھا۔

"ہاں۔ وہاں جانا ہی گا۔ اس کے بغیر کام نہیں چلے گا۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس سے پہلے ان سُنہری ڈبیوں کے بارے میں بھی کچھ معلوم ہو جائے۔"

"تو پھر اب کیا ارادہ ہے؟" منوّر علی خاں بولے۔

"میں اب ان ڈبیوں پر کام کروں گا۔" انھوں نے کہا۔

"ابا جان ہم بھی آپ کے ساتھ رہیں گے۔" آفتاب نے کہا۔

"نہیں۔ میں تنہا بہتر کام کر سکوں گا۔ تم سب آرام کرو۔"

"ان تیروں کے بارے میں بھی ابھی کچھ معلوم نہیں ہوا۔" فرحت بولی۔

"ان کے بارے میں کچھ معلوم کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔ میرا خیال ہے یہ سُرخ موت کی وادی کے کسی پودے کی لکڑی سے بنائے جاتے ہیں اور زہریلے ہوں گے۔"

"کیا اس قسم کا کوئی اشارہ آپ کو اس مضمون میں ملا ہے؟" آفتاب نے کچھ سوچ کر کہا۔

"کیوں؟ تم نے یہ اندازہ کیسے لگایا؟" کامران مرزا نے اُسے گھورتے ہوئے کہا۔

"اس لیے کہ اس سے پہلے آپ نے ان کے بارے میں کوئی رائے ظاہر نہیں کی۔"

"تمھارا خیال ٹھیک ہے۔ اس مضمون میں اگرچہ وضاحت سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ پھر بھی اسے پڑھ کر اندازہ ضرور لگایا جا سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ پھر آپ ان ڈبیوں کا جائزہ لے لیں۔"

ایک گھنٹے بعد کامران مرزا کے چہرے پر کامیابی کی خوشی نظر آ رہی تھی۔ انھوں نے خود ہی دروازہ کھول کر انھیں بلایا تھا۔

"شاید آپ ان کے بارے میں کچھ معلوم کرنے میں

کامیاب ہو گئے ہیں۔" آفتاب نے کہا۔

"ہاں۔ میں نے ان ڈبیوں پر کئی تجربات کیے، انھیں کھولنے کی کئی گھنٹے کوشش کی اور آخر میں کامیاب ہو گیا۔" یہ کہہ کر وہ مسکرائے۔

"کامیاب ہو گئے؟ آخر کیسے؟" آصف نے حیران ہو کر کہا۔

"ہوا یہ کہ جب میں تجربے کر کر کے تھک گیا تو تھوڑی دیر سوچنے کے لیے کرسی کی پشت سے لگ کر بیٹھ گیا۔ بے خیالی میں مَیں نے سگار سُلگا لیا۔"

"لیکن ابا جان، آپ تو سگار یا سگرٹ پیتے ہی نہیں" آفتاب نے حیران ہو کر کہا۔

"یہ ٹھیک ہے۔ میں ان چیزوں کا عادی نہیں۔ لیکن کبھی کبھار جب کوئی مسئلہ سمجھ میں نہیں آتا تو سگار سُلگا کر سوچ میں کھو جاتا ہوں۔ اس وقت بھی یہی ہوا۔ میں نے سگار سُلگا لیا اور ایک کش لے کر ایش ٹرے میں رکھ دیا۔ اچانک میں چونک اٹھا۔ بیٹھے بٹھائے مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ ڈبیاں کیا بلا ہیں۔"

"کیا مطلب؟" وہ چونکے۔

"ڈبیاں ایش ٹرے کے بالکل قریب رکھی تھیں۔ میں

دھوئیں کی لکیر کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک میری نظر ڈبیا پر پر پڑ گئی۔ میں حیران رہ گیا۔ اس کا رنگ سُرخ ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے اُسے چھو کر دیکھا۔ وہ ہلکی سی گرم ہو چکی تھی۔ اس میں سے مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی آواز اُبھرنے لگی۔"

"کیا !!!" ان سب کے منھ سے نکلا۔

"تمھیں یاد ہو گا .... جب جارج سے اس کے آقا نے سُرخ وادی سے بات کی تھی تو اس سے پہلے کمرے میں سُرخ روشنی پھیل گئی تھی اور مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی آواز گونجنے لگی تھی۔ پھر مکھیوں کی بھنبھناہٹ غائب ہو گئی تھی اور "اس" کی آواز آئی تھی۔"

"جی ہاں ۔ ہمیں یاد ہے۔" آفتاب کہتے کہتے رک گیا۔

"یہ ڈبیاں ایک طرح کے ٹرانسمیٹر ہیں، اور یہ لوگ اس سے پیغام بھیجنے کا کام لیتے ہیں۔ میں نے اس کے بعد سگار کو دوسری ڈبیوں کے پاس رکھ کر دیکھا تھا۔ ان کا رنگ بھی سُرخ ہو گیا تھا اور ان میں سے بھی بھنبھناہٹ کی آواز آئی تھی۔"

"کسی کے بات کرنے کی آواز بھی آئی تھی؟" مُنوّر علی خاں نے پوچھا۔

"نہیں۔ ظاہر ہے، اِدھر سے کوئی بات کی جائے گی تو جواب ملے گا، لیکن میں نے بات نہیں کی۔"

"چلیے یہ مسئلہ بھی حل ہوا۔ اب ہمیں کیا کرنا ہے؟" آفتاب نے خوش ہو کر کہا۔

"چلنے کی تیاری" کامران مرزا نے کہا اور سوچ میں گم ہو گئے۔

"آپ کیا سوچنے لگے؟" فرحت نے پوچھا۔

"میں سوچ رہا ہوں... وہ شخص کون ہے جس نے پروفیسر جیلانی کو ختم کیا ہے؟"

عین اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ وہ سب چونک اٹھے۔ کامران مرزا نے جلدی سے فون کا ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔ انھوں نے دیکھا، ان کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی جا رہی تھیں۔ وہ سوچنے لگے، شاید دوسری طرف سے کوئی بہت ہی حیرت انگیز خبر سنائی جا رہی ہے۔ کوئی ایک منٹ تک دوسری طرف کی گفتگو کو سننے کے بعد کامران مرزا بولے:

"مجھے اب اس مُہم پر روانہ ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ مجھے جانا ہی پڑے گا۔"

دوسری طرف سے سلسلہ بند ہونے کے بعد انھوں نے

ریسیور رکھ دیا اور ان کی طرف مڑے۔ وہ ان کو عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"خیریت تو ہے؟" منّور علی خاں بولے۔

"معلوم ہوتا ہے، آپ نے کوئی بہت ہی اہم خبر سنی ہے۔" آفتاب نے کہا۔

"ہاں۔ ایسی اہم اور حیرت ناک کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ یہ سیکرٹری صاحب کا فون تھا۔ انھوں نے اطلاع دی ہے کہ پروفیسر جیلانی کی لاش کوٹھی سے غائب ہے۔ پولیس لاش اٹھانے کے لیے وہاں گئی تو پوری کوٹھی میں کوئی نہ تھا۔ یہاں تک کہ ان کا ملازم بھی نہیں ملا۔"

"اوہ!" وہ حیرت زدہ رہ گئے۔

کچھ دیر کمرے میں موت کی سی خاموشی چھائی رہی۔ وہ سب سوچ میں گم ہو کر رہ گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جارج اور اس کے ساتھیوں کی گرفتاری کے بعد ان کے ملک میں دشمن کا کوئی اور آدمی نہ ہوگا لیکن پروفیسر جیلانی کی موت پر اُنھوں نے جان لیا کہ کوئی اور بھی یہاں موجود ہے ... اور اب پروفیسر جیلانی کی لاش بھی غائب کر دی گئی تھی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ کچھ اور لوگ بھی یہاں موجود ہیں جو اُن کی مُہم کے دوران ضرور رُکاوٹ

بنیں گے۔

پروفیسر جیلانی کی لاش کے غائب ہو جانے کے بعد کامران مرزا بہت سنجیدہ ہو گئے تھے اور دوسرے دن سے اُنھوں نے مُہم پر روانہ ہونے کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے منّور علی خاں سے بھی کہہ دیا تھا کہ یہ مہم ایک یادگار مہم ثابت ہوگی، اس لیے وہ بھی تیاری کر لیں۔ کامران مرزا نے ضروری چیزوں کا ایک بنڈل تیار کروایا اور اسے جیپ کی چھت پر بندھوا دیا۔ اس کے ساتھ انھوں نے پانچ پستول اور ایک مشین گن کا بھی انتظام کیا۔

منّور علی خاں نے اپنا شکاری چاقو، ریشم کی ڈوری اور دستی بموں والا تھیلا جیپ کے ایک خانے میں رکھ دیا۔

بچے اپنی تیاریوں میں مصروف تھے۔ اُنھوں نے چمڑے کی مضبوط بیلٹیں خریدیں جن کے سروں پر لوہے کے ہُک لگے ہوئے تھے اور وقت پڑنے پر وہ انھیں ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ لوہے کی سٹِک بھی جیپ میں رکھ لی۔ فرحت نے کرکٹ

کی تین گیندیں ایک خانے میں رکھ لیں۔ ایک موٹا رسّا اور ریشم کی ڈوری کا ایک گولا بھی اُنھوں نے جیب میں رکھ لیا۔ کھانے پینے کی بے شمار چیزیں بھی ساتھ لے لی گئیں۔ بچّے بھی تیاریوں میں مصروف تھے۔ ان دنوں وہ اپنی شوخیاں، طراریاں بھول گئے تھے۔ دن میں ایک دو مرتبہ وزیرِ داخلہ یا سیکرٹری صاحب کا فون ضرور آ جاتا۔ کامران مرزا انھیں یہی جواب دیتے:

"ہم بہت جلد روانہ ہونے والے ہیں۔"

سیکرٹری نے ایک دن تجویز پیش کی کہ انھیں پولیس کے کچھ جوان بھی ساتھ لے جانے چاہئیں۔ لیکن کامران مرزا نے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ صرف اپنے ملازم فضلو کو لے جائیں گے اور بس۔

بچّے یہ سن کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ وہ پوچھ بیٹھے "فضلو آپ کے ساتھ جا کر کیا کرے گا؟"

کامران مرزا مسکرائے اور بولے "ہمیں پہاڑوں کے درمیان سفر کرنا ہوگا۔ یہ سفر کافی طویل بھی ہو سکتا ہے۔ اس دوران میں فضلو ہمارے بہت کام آئے گا۔ وہ ہمارے لیے کھانا تیار کرے گا، چائے بنائے گا۔"

پروفیسر جیلانی کی موت کے ٹھیک پانچ دن بعد وہ

روانگی کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ روانہ ہونے سے پہلے کامران مرزا نے ان کے جسموں پر زرد سیّال کی مالش کر دی تاکہ گیس پستول ان پر اثر نہ کر سکے۔ اس کے ساتھ ہی اُنھوں نے ایک شیشی منوّر علی خاں کو دے دی، ایک خود رکھ لی اور ایک بچّوں کو دی۔ انھوں نے ہدایت کی کہ ہر چوبیس گھنٹے بعد اس زرد سیّال کی مالش ضرور کرتے رہیں۔ ان کا خیال تھا کہ اس سیّال کا اثر صرف چوبیس گھنٹے تک رہتا ہے۔

"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟" آفتاب نے پوچھا۔

"اگر اس کا اثر چوبیس گھنٹے سے زیادہ دیر رہتا تو پھر جارج کے آدمیوں کو یہ شیشیاں ساتھ رکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس صورت میں وہ زمین دوز دُنیا سے اپنے جسم پر سیّال کی مالش کر کے بھی روانہ ہو سکتے تھے۔ ان شیشیوں کا ان کے پاس ہونا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ اس سیّال کا اثر چوبیس گھنٹے تک رہتا ہے۔"

جس روز وہ مہم پر روانہ ہونے والے تھے وزیرِ داخلہ اور سیکرٹری صاحب ان سے ملنے آئے۔ کامران مرزا نے ان سے کہا:

"ہو سکتا ہے، ہم اس مہم سے زندہ سلامت واپس

نہ آسکیں۔ آپ ہم لوگوں کا صرف ایک ماہ تک انتظار کریں۔ ایک ماہ بعد واپس نہ آئیں تو پھر آپ انسپکٹر جمشید کو تمام حالات بتا دیں اور اس رسالے کا یہ مضمون بھی انھیں دکھا دیں۔ وہ سمجھ جائیں گے کہ انھیں کیا کرنا ہے۔"

"ہمیں امید ہے کہ آپ کامیاب لوٹیں گے اور اس کی نوبت نہیں آئے گی۔" وزیرِ داخلہ نے کہا۔

اس کے بعد وہ جیپ میں بیٹھ گئے۔ وزیرِ داخلہ اور سیکرٹری صاحب ہاتھ ہلا کر انھیں الوداع کہنے لگے وہ اس وقت تک ہاتھ ہلاتے رہے جب تک جیپ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔

کامران مرزا اور منوّر علی خاں، اگلی سیٹوں پر بیٹھے تھے۔ کامران مرزا جیپ ڈرائیور کر رہے تھے۔ بچّے پچھلی سیٹ پر تھے۔ فضلو بھی ان کے ساتھ تھا۔ انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ کہاں جانا ہے، کس راستے پر جانا ہے۔ یہ بات تو صرف کامران مرزا جانتے تھے۔ انھیں تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ یہ سفر کتنے دیر کا ہے۔ ان سب باتوں سے بے نیاز وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ کئی دن بعد انھیں باتیں کرنے کا موقع ملا تھا۔

"میں صرف یہ بات سوچ رہا ہوں کہ آخر وہ کون ہے جس نے یشوما کو سُرج موت کی وادی سے بھگایا تھا اور یہ ہدایت کی تھی کہ ابّا جان یا انسپکٹر جمشید کو جا کر حالات سے باخبر کر دے۔" آفتاب کہہ رہا تھا۔

"وہ بھی کوئی وطن دوست ہوگا اور کسی طرح ان میں پھنس گیا ہوگا۔" آصف نے جواب دیا۔

"ہاں، جس طرح یشوما کو پھانسا گیا تھا۔" فرحت بولی۔

"وہ اسے اس طرح نہیں پھانس سکتے تھے۔ اس شخص کے لیے ضرور کوئی اور طریقہ اختیار کیا گیا ہوگا۔" آفتاب نے کہا۔

جہاں تک میرا خیال ہے، وہ ضرور کوئی سائنس دان ہوگا۔" آصف نے سوچتے ہوئے کہا۔

"کون؟ مجرم یا وہ شخص جس نے یشوما کو بھگایا تھا؟" فرحت نے کہا۔

"وہی۔ ویسے تو مجرم خود بھی کوئی سائنس دان ہی ہوگا۔"

"اور کوئی غیر ملکی ہوگا۔ ہم نے زمین دوز دنیا میں اس کی آواز سنی تھی۔" آفتاب بولا۔

"ہاں۔ اس کا لہجہ انگریزوں جیسا تھا۔" فرحت نے کہا۔

"ابھی تک میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ آخر یہ چکّر کیا ہے! اس سازش کے پیچھے کون سا مقصد کام کر رہا ہے! یہ لوگ چاہتے کیا ہیں!"

ان کی جیپ بھری پڑی سڑکوں سے گزر رہی تھی۔ ابھی تک وہ اپنے شہر ہی میں تھے۔ البتّہ اب شہر کی حد ختم ہو رہی تھی اور وہ باہر نکلنے والے ہی تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ کیا شہر سے نکلنے کے بعد وہ اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے؟ آخر یہ سوال ان کی زبان پر آ ہی گیا۔ کامران مرزا مسکرائے اور بولے:

"ابھی منزل بہت دور ہے۔ ابھی تو ہمیں گھنے جنگلوں میں سفر کرنا ہے"

پہلا وار

شہر سے نکلنے کے بعد کامران مرزا نے جیپ کی رفتار بڑھا دی۔ اس وقت تک انھیں سفر کرتے ہوئے دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ شہر سے باہر سڑک کے دونوں طرف لہلہاتے کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کارخانوں کی دُھواں چھوڑتی ہوئی چمنیاں بھی نظر آجاتی تھیں۔ سامنے سے گزرنے والی گاڑیوں کی تعداد بہت کم تھی۔

ٹھیک دو گھنٹے بعد وہ ایک اور شہر میں داخل ہو رہے تھے۔ ایک ہوٹل کے سامنے کامران مرزا نے جیپ روک دی۔ یہاں انھوں نے چائے پی اور کچھ ہلکی پھلکی چیزیں کھائیں۔ ایک بار پھر ان کا سفر شروع ہو گیا۔

"تم لوگ بور تو نہیں ہو رہے؟" کامران مرزا نے پوچھا۔

"جی؟ بور؟ بھلا وہ کیوں؟" آصف نے کہا۔

"میرا مطلب ہے، سفر بغیر کسی رکاوٹ کے جاری

ہے۔ کوئی خطرہ یا اُلجھن سامنے نہیں آ رہی۔"

"اُلجھنیں ہمارا پیچھا کب چھوڑنے والی ہیں۔ ضرور آگے کہیں ہمارا انتظار کر رہی ہوں گی۔" آفتاب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بالکل، اور ہم ان کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہیں۔"

"شاید سُرخ موت کی وادی تک کوئی ہمارا راستہ نہ روکے۔" کامران مرزا بولے۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہمارے شہر میں ابھی دشمن کے کچھ آدمی موجود ہیں۔ کیا وہ خاموشی سے بیٹھے رہیں گے۔ ضرور وہ کوئی نہ کوئی کارروائی کریں گے یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ ہماری روانگی سے بے خبر رہے ہوں۔" منوّر علی خاں نے کہا۔

"تم بھی ٹھیک کہتے ہو۔ خیر، دیکھا جائے گا۔" کامران مرزا نے کہا "میں نے تو یہ بات اس لیے کہی ہے کہ ابھی تک ہمارا پیچھا نہیں کیا گیا۔"

"اوہ! اس طرف تو ہمارا دھیان ہی نہیں گیا۔" آفتاب نے چونک کر کہا۔

واقعی کامران مرزا ٹھیک کہہ رہے تھے۔ اس صورت میں، جب کہ شہر میں ان کے دُشمن ابھی موجود تھے، انھیں

ضرور تعاقُب کرنا چاہیے تھا۔ اور اگر انھوں نے تعاقُب نہیں کیا تو اس کا مطلب صرف یہ تھا کہ انھیں اس کی ہدایت کر دی گئی تھی، اور دشمن خود یہ چاہتا تھا کہ وہ سرخ موت کی وادی میں پہنچ جائیں۔

"ابا جان، آخر یہ سفر کب ختم ہو گا؟" آفتاب نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

"ابھی تو ہمیں سفر کرتے ہوئے صرف چار گھنٹے ہی ہوئے ہیں۔"

"تو کیا یہ سفر بہت طویل ہو گا؟"

"ہاں۔ خیال تو یہی ہے۔"

"میں جلد از جلد سُرخ موت کی وادی میں پہنچ جانا چاہتا ہوں۔"

"تو پھر تم اکیلے ہی چلے جاؤ کیونکہ ہم تو وقت پر ہی پہنچیں گے۔" فرحت مسکرائی۔

"چیونٹی کے بھی پر نکل آئے۔" آفتاب نے کہا

"ہاں۔ دیکھ لو۔۔۔ جیپ میں اُڑی جا رہی ہوں۔"

"ہوا میں بھی اُڑنے لگو تو بھی مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔" آفتاب نے کہا۔

"بھئی، تم دونوں کیا بے پر کی اُڑانے لگے۔" آصف

کو بھی جملہ کسنے کی سُوجھی۔

"یک نہ شُد دو شُد۔ بی مینڈکی کو بھی زکام ہوا۔" آفتاب بولا۔

میں مینڈکی ہوں اور فرحت چیونٹی۔ یہ تو بتاؤ، تم خود کیا ہو؟ آصف نے کہا۔

"آفتاب۔" آفتاب نے معصومیّت سے کہا اور کامران مرزا، منُوّر علی خان اور فضلو مسکرانے لگے۔

"لو بھئی، یہ تو شروع ہو گئے۔" کامران مرزا بولے۔

"چلو، اچھا ہے۔ ان حالات میں خاموش بیٹھنا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔"

"جی ہاں۔ وقت اچھی طرح کٹے گا۔" فضلو پہلی دفعہ بولا۔

"شکر ہے۔ بابا فضلو نے بھی زبان کو حرکت دی۔ میں تو سمجھا تھا، یہ جیپ میں بیٹھتے وقت منھ میں گھنگنیاں ڈال کر بیٹھے ہیں۔"

"گھنگنیاں تو میں بہت شوق سے کھاتا ہوں جی، لیکن قسم لے لیجیے، چلتے وقت میں نے ہرگز نہیں کھائی تھیں۔" فضلو کی اس بات پر ایک قہقہہ گونجا۔ لیکن اسی وقت ان کے قہقہے کا گلا گھُٹ کر رہ گیا۔ وہ اس طرح

خاموش ہو گئے جیسے جنگل میں کسی بھوت کو دیکھ لیا ہو۔ ان کی نظریں سامنے سڑک پر جمی کی جمی رہ گئیں۔

سڑک کے بیچ ایک بڑا سا پتھر رکھا تھا۔ اس پتھر کے سہارے ایک بلیک بورڈ کھڑا کیا گیا تھا اور اس بلیک بورڈ پر لکھا تھا:

"سُرخ موت کی وادی کا سفر کرنے والو! ہم تمھارے استقبال کے لیے تیار ہیں اور تمھیں خوش آمدید کہتے ہیں۔"

جیپ پتّھر کے بالکل قریب رُک گئی تھی اور بلیک بورڈ پر لکھے الفاظ انھوں نے جیپ میں بیٹھے بیٹھے ہی پڑھ لیے تھے۔ لیکن جیپ کو آگے بڑھانے کے لیے انھیں نیچے اُتر کر پتّھر کو سرکانا تھا۔

وہ نیچے اترے۔ پتّھر زیادہ بڑا نہیں تھا۔ کامران مرزا نے اسے اٹھا کر ایک درخت کے نیچے رکھ دیا۔ پھر انھوں نے بلیک بورڈ بھی اٹھا کر پتّھر کے ساتھ لگا کر کھڑا کر دیا۔ اسی وقت ان کی نظر سڑک پر پڑی وہاں چاک کا ایک ننّھا سا ٹکڑا پڑا تھا۔ انھوں نے چاک کا ٹکڑا اٹھا لیا، پھر بلیک بورڈ پر لکھے الفاظ مٹائے اور ان کی جگہ لکھ دیا: شکریہ۔ ہم پہنچ رہے ہیں۔

اس کے بعد وہ پھر جیپ میں بیٹھ گئے اور آگے چل پڑے۔

"تو دشمن بے خبر نہیں ہے۔ وہ ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔" منوّر علی خاں بولے

"ہاں، میرا خیال غلط تھا، اور اب ہمیں ہوشیار ہو جانا چاہیے۔ آگے چل کر اُن سے مُٹھ بھیڑ ضرور ہو گی۔" کامران مرزا بولے۔

"اگر ہم پر حملہ ہوا تو اس کا مطلب یہی ہو گا کہ وہ ہمیں اس وادی سے دور ہی رکھنا چاہتا ہے۔" آفتاب بولا۔

"لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ ہم واپس لوٹ کر بھی جانے نہ پائیں کیوں کہ میں سُرخ موت کی وادی کا راستہ جان گیا ہوں اور ان کا اس راستے میں بورڈ لکھ کر لگانے کا مطلب بھی یہی ہے کہ میں ٹھیک راستے پر جا رہا ہوں۔"

جیپ برق رفتاری سے اپنا راستہ طے کر رہی تھی۔ اس وقت سُورج غروب ہو رہا تھا۔ شام کا اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ انھیں اب بھوک محسوس ہونے لگی تھی۔ اچانک کامران مرزا نے کہا:

"جیپ کے پردے گرا لو۔ بھوک لگی ہے تو

کچھ کھا لو۔ ہم رات کو قیام نہیں کریں گے۔ ساری رات سفر جاری رکھیں گے۔"

جیپ میں کھانے کی چیزوں کا کافی ذخیرہ تھا۔ انھوں اپنی پسند کی کچھ چیزیں نکال لیں اور کامران مرزا کے سوا، سب کھانے لگے۔ کامران مرزا جیپ چلانے میں مصروف تھے۔ انھوں نے کھانے کے لیے بھی جیپ روکنا مناسب نہیں سمجھا۔ جب منوّر علی خان کھا چکے تو انھوں نے سٹیرنگ انھیں تھمایا اور خود برابر والی سیٹ پر بیٹھ کر کھانے لگے۔

کھانے سے فارغ ہو کر کامران مرزا نے پھر جیپ سنبھال لی اور ان سے بولے۔"اب اگر تم لوگ سونا چاہو تو تو بڑی خوشی سے سو سکتے ہو۔"

"ٹھیک ہے۔ نیند آئے گی تو سو جائیں گے۔" آفتاب بولا۔

"جی ہاں: فی الحال تو ہمارا باتیں کرنے کا پروگرام ہے۔" فرحت نے کہا۔

"اور یہ بھی ظاہر ہے کہ باتیں اُوٹ پٹانگ کریں گے۔" آصف بولا۔

باتیں کرتے کرتے نہ جانے کب ان کی آنکھ لگ گئی۔

جیپ کے ہچکولے ان کی نیند کو گہرا کرتے چلے گئے، یہاں تک کہ منوّر علی خاں بھی سو گئے۔ اب صرف کامران مرزا جاگ رہے تھے۔ اس وقت وہ ایک ویران جنگل میں سے گزر رہے تھے۔ ان کے دونوں طرف لمبے لمبے درخت یوں کھڑے تھے جیسے صدیوں سے سڑک کا پہرا دے رہے ہوں۔ کامران مرزا نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ چاروں طرف ہُو کا عالم تھا۔ انھوں نے گردن سیدھی کر کے سامنے دیکھا اور ایک دم بریک لگا دیے۔

جیپ کو ایک زور دار دھچکا لگا اور سب لوگ ہڑبڑا کر جاگ گئے۔ انھوں نے چونک کر دیکھا۔ وہ ایک جنگل میں تھے۔ آسمان پر چاند نکلا ہوا تھا اور چاندنی نے پورے جنگل کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

"کیا ہوا؟" منوّر علی خاں نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا
"آپ نے جیپ کیوں روک دی؟" آفتاب بھی بول پڑا۔
"سامنے سڑک پر دیکھو۔ خود بخود سمجھ جاؤ گے۔"
سب نے چونک کر سڑک کی طرف دیکھا۔

چاند کی روشنی میں سڑک کے آرپار، دو درختوں سے بندھا ہوا موٹا سا رسّا صاف نظر آ رہا تھا۔
"معلوم ہوتا ہے ہم سُرخ وادی کے نزدیک پہنچ گئے ہیں" منوّر علی خاں نے کہا۔
"نہیں۔ ابھی ہم بہت دور ہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے، دشمن اس جگہ ہم سے دو دو ہاتھ کرنا چاہتے ہیں" کامران مرزا نے جواب دیا۔
"تو کیا آپ ان سے دو دو ہاتھ کریں گے؟" آفتاب نے پوچھا۔
"میری تو کوشش یہی ہے کہ میں ان سے بھڑے بغیر ہی نکل چلوں۔ لیکن اگر مقابلہ کرنا پڑا تو ہم کمزور نہیں پڑیں گے۔" انھوں نے کہا۔
"پھر، اب کیا ارادہ ہے؟"
"معلوم ہوتا ہے، دشمن جنگل میں چھپے ہوئے ہیں۔ رسّے کو ہٹانے کے لیے ہمیں جیپ سے اُترنا پڑے گا اور یہی وقت ان کے حملہ کرنے کا ہو گا" کامران مرزا نے بتایا۔
"تو کیا آپ انھیں اس قسم کا موقع دیں گے؟" آفتاب نے پوچھا۔

"کیوں منوّر علی خاں، کیا کرنا چاہیے؟" کامران مرزا نے پوچھا۔

"بھئی میری تو عقل خبط ہے۔ میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ البتہ جو تم کہو گے، اس پر عمل کروں گا۔"

"بھئی آصف اور آفتاب، تم ہی کچھ بتاؤ۔ ایسے میں تو شاید میری عقل بھی گھاس چرنے چلی گئی ہے۔" کامران مرزا نے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے ترکیب آپ کی سمجھ میں آ گئی ہے" آفتاب نے چونک کر کہا۔

"تمھارا اندازہ ٹھیک ہے۔ لیکن ذرا جلدی سے تم بھی ذہن پر زور دو اور بتاؤ کہ ایسے میں کیا کیا جا سکتا ہے۔"

"لیجیے، میں بتاتا ہوں۔ دشمن نے یہاں بہت بھونڈی چال چلی ہے۔ اس نے یہ نہیں سوچا کہ ہم جیپ سے اُترے بغیر اس رسّے کا انتظام کر سکتے ہیں۔"

"جیپ سے اُترے بغیر؟ مگر کیسے؟" منوّر علی خان نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"جی ہاں۔ ابّا جان جیپ سٹارٹ کر کے آگے بڑھیں گے۔ ان کے دائیں ہاتھ میں ریوالور ہو گا۔ دوسری طرف

آپ کے ہاتھ میں بھی ایک ریوالور ہو گا۔ آپ دونوں بیک وقت رسّے پر فائر کریں گے۔ آپ میں سے کسی ایک کا نشانہ بھی ٹھیک بیٹھا تو رسّا غائب ہو جائے گا اور جیپ گزرتی چلی جائے گی۔ اور یہ بات شاید ان لوگوں کو معلوم ہی نہیں کہ آپ کا نشانہ بہت پُختہ ہے۔"

"بہت خوب! بالکل یہی ترکیب میں نے بھی سوچی تھی۔ تو چلو منوّر علی خاں ریوالور سنبھال لو۔ رسّے کے دائیں طرف میں اور بائیں طرف تم فائر کرو گے۔ اس دوران میں جیپ پوری رفتار سے آگے بڑھے گی۔ جیپ کی رفتار آہستہ رکھی گئی تو خطرہ ہے، ہم دشمن کی گولیوں کی زد میں نہ آ جائیں۔"

جیپ ایک دم تیر کی طرح آگے بڑھی، پوری رفتار سے، اور آناً فاناً رسّے کے قریب پہنچ گئی۔ اسی وقت دو فائر ہوئے اور دونوں گولیاں رسّے پر لگیں۔ رسّا دو جگہ سے ٹوٹ گیا، فضا میں اُچھلا۔ عین اسی وقت جیپ اُس کے نیچے سے گزرتی چلی گئی۔ انھوں نے اپنے پیچھے بیسیوں فائروں کی آواز سنی۔ چند ایک گولیاں جیپ کی دیواروں سے بھی ٹکرائیں۔ لیکن یہ جیپ خاص قسم کی تھی۔ ان گولیوں کا اس پر ذرا بھی اثر نہ ہوا۔

پہلا مرحلہ خیریت کے ساتھ طے ہو گیا تھا۔ جیپ ایک بار پھر فرّاٹے بھرتی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ چاند ایک سمت میں جھکتا چلا جا رہا تھا۔

دوسرے دن ٹھیک گیارہ بجے ان کی جیپ ایک شہر میں داخل ہوئی۔ یہ ایک سرحدی شہر تھا۔ جب یہ بات کامران مرزا نے انھیں بتائی تو تینوں بچے چونک اٹھے۔ منوّر علی خاں نے انھیں چونکتے دیکھا تو پوچھے بغیر نہ رہ سکے:

"کیا بات ہے بھئی؟"

"اس کیس کے دوران میں ہم نے کہیں سرحدی شہر کا ذکر بھی سنا تھا لیکن اب یاد نہیں آ رہا کہ کہاں سنا تھا۔" آصف بولا۔

"مجھے یاد ہے" کامران مرزا بول اٹھے "جب ہم پروفیسر جیلانی سے ملنے گئے تھے تو اس کے ملازم نے کہا تھا کہ پروفیسر صاحب ابھی ابھی سرحدی شہر والی رصد گاہ سے واپس لوٹے ہیں۔"

"تو کیا اس شہر میں کوئی رصد گاہ بھی ہے؟" فرحت نے پوچھا۔

"ہاں، اور اس کے انچارج پروفیسر جیلانی تھے وہ دارالحکومت میں اپنی تجربہ گاہ میں بھی رہتے تھے اور یہاں بھی آ جاتے تھے۔ اس کے لیے حکومت نے انھیں ایک ہوائی جہاز دے رکھا تھا۔"

"کیا آپ کا ارادہ یہاں ٹھہرنے کا ہے؟"

"ہاں۔ ہمیں ایک آدھ دن رکنا پڑے گا۔ کیوں کہ اب جو سفر ہمیں درپیش ہے، وہ اس جیپ میں ممکن نہیں۔ آگے راستہ پہاڑی ہے اور ہمیں گھوڑوں یا خچروں پر سفر کرنا ہو گا۔"

جیپ ایک ہوٹل کے سامنے رک گئی تھی۔ اس کا نام تھری سٹار ہوٹل تھا۔ کامران مرزا نے انھیں بتایا کہ اس ہوٹل کے دو کمرے ہمارے لیے سرکاری طور پر مخصوص کرائے گئے ہیں۔ ہم دو دن تک یہاں ٹھہریں گے تاکہ میں گھوڑوں یا خچروں کا انتظام کر لوں۔

انھوں نے جیپ مناسب جگہ کھڑی کی اور ملازموں کی نگرانی میں اپنے کمروں تک آئے۔ یہ تیسری منزل پر تھے۔ ان کا سامان ہوٹل کے ملازموں نے اٹھا رکھا تھا۔

پھر جوں ہی وہ ایک کمرے میں داخل ہوئے ان کے اُٹھتے قدم رُک گئے۔ کمرے میں ایک بڑا سا کاغذ پڑا تھا جس پر نیلی روشنائی سے موٹے موٹے لفظوں میں لکھا تھا:

"خوش آمدید!"

وہی آواز

وہ دم بخود کھڑے رہ گئے۔ ہوٹل کے ملازم بھی اس کاغذ کو دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ کامران مرزا نے ان سے پوچھا:

"یہ کیا ماجرا ہے؟ کیا یہاں ہر مسافر کے کمرے میں اسی قسم کا پوسٹر لگایا جاتا ہے؟"

"جی... جی... نہیں تو۔ ہم خود حیران ہیں کہ یہ یہاں کہاں سے آگیا!"

"ہوں! خیر، تم سامان رکھ کر جا سکتے ہو، اور دیکھو! اس کا کسی سے ذکر نہ کرنا۔"

"معلوم ہوتا ہے، دشمن ہمارے آگے آگے چل رہا ہے۔" منوّر علی خاں بولے۔

"ہاں۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ہم اس ہوٹل کے کن کمروں میں ٹھہریں گے۔ جو شخص اس حد تک باخبر

ہو، اس سے مقابلہ کچھ آسان ثابت نہ ہوگا" کامران مرزا بولے۔

"تو کیا، آپ ہمت ہار رہے ہیں؟" آفتاب نے ہو کر کہا۔

"نہیں - یہ میری زندگی اور موت کا سوال ہے۔ میں آگے بڑھوں گا... اس وقت تک آگے بڑھوں گا جب تک میرے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی موجود ہے"

"آپ ہمیں اپنے ساتھ پائیں گے" آفتاب نے تیزی سے کہا۔

"میں جانتا ہوں - آپ تم لوگ آرام کرو۔ میں گھوڑوں کا بندوبست کر کے آتا ہوں" وہ اٹھتے ہوئے بولے۔

"میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ تمہارا تنہا جانا ٹھیک نہیں" منوّر علی خاں بولے

"بچے یہاں اکیلے رہ جائیں گے"

"ہماری فکر نہ کریں - ہم اپنی حفاظت خوب کر سکتے ہیں" آصف نے کہا۔

"بس، پھر ٹھیک ہے۔ ہم چلتے ہیں" کامران مرزا اور منوّر علی خاں اٹھ کھڑے ہوئے۔

ان کے جاتے ہی آفتاب نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ آصف اور فرحت نے کھڑکیاں بند کر دیں۔ غسل خانے میں کھلنے والے کمرے کے دروازے کو بھی بند کر دیا گیا۔ یہ تمام احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کے بعد وہ اطمینان سے بستروں پر لیٹ گئے۔ وہ بری طرح تھکے ہوئے تھے۔ انھوں نے مسلسل اٹھارہ گھنٹے سفر کیا تھا۔ تھکن کی وجہ سے وہ آپس میں کوئی بات بھی نہ کر سکے۔ جلد ہی نیند نے انھیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

نہ جانے وہ کتنی دیر سوتے رہے۔ اچانک آفتاب کی آنکھ کھل گئی۔ وہ چونک اٹھا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس نے جلدی جلدی آصف اور فرحت کو جگایا، اور فوراً ہی ان کی بھی وہی حالت ہوئی۔ فضلو البتہ ابھی تک خراٹے لے رہا تھا۔ انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور دم بخود لیٹے اس آواز کو سننے لگے جسے سن کر آفتاب کی آنکھ کھلی تھی۔ کمرے میں گونجنے والی آواز غیر مانوس نہ تھی۔ اس آواز کو وہ پہلے بھی کئی بار سُن چکے تھے۔ یہ وہی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی آواز تھی۔

انھوں نے کمرے میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی لیکن جان نہ سکے کہ آواز کہاں سے آ رہی ہے! اب تو وہ بہت پریشان ہوئے اور اٹھ کر آواز کی سمت کا اندازہ کرنے لگے۔ دیواروں سے بھی کان لگا کر دیکھا۔ ایسے میں انھیں یاد آیا کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں، لیکن دیواروں میں سے بھی یہ آواز آتی محسوس نہیں ہوئی۔ اگرچہ کمرے میں ابھی تک گونج رہی تھی۔

اچانک آفتاب سوٹ کیسوں کے پاس فرش پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا۔ پھر وہ زور سے اُچھل پڑا۔

"کیا ہوا؟ کیا کسی بچھو نے کاٹ لیا ہے؟" آصف نے پوچھا۔

"میں نے معلوم کر لیا ہے کہ آواز کہاں سے آ رہی ہے۔"

"اچھا، تو پھر بتاتے کیوں نہیں"

"ابا جان کے سوٹ کیس سے۔" آفتاب نے کہا اور مسکرانے لگا۔

"کیا!!" وہ سب اُچھل پڑے۔

"اور اس میں وہ سنہری ڈبیاں موجود ہیں۔" آفتاب بولا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ خدا کے لیے اسے کھولو۔" فرحت نے بے چین ہو کر کہا۔

آفتاب کے پاس چابیاں موجود تھیں۔ اس نے سوٹ کیس کھولا۔ دوسرے ہی لمحے وہ حیرت زدہ رہ گئے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے تینوں سنہری ڈبیاں پڑی تھیں۔ ان کا رنگ اس وقت سرخی مائل ہو گیا تھا۔ بھنبھناہٹ کی آواز اُنھی میں سے آ رہی تھی۔ پھر اچانک بھنبھناہٹ غائب ہو گئی اور ایک صاف آواز ان میں سے اُبھری:

"کامران مرزا جب گھوڑے خرید کر واپس آئے تو اُسے بتا دینا کہ میں جس وقت چاہوں تم سب کو ختم کر سکتا ہوں یہ سُنہری ڈبیاں جو تم ساتھ لیے پھرتے ہو، اگر میں چاہتا تو ایک بم کی طرح پھٹ سکتی تھیں اور تم لوگوں کے پرخچے اُڑ جاتے۔ لیکن۔۔۔ میں تو دراصل تم لوگوں کو سُرخ موت کی وادی کی سیر کرانا چاہتا ہوں۔ میں ایسا کیوں چاہتا ہوں؟ یہ یہاں پہنچنے پر بتاؤں گا۔ کامران مرزا اگر مجھ سے کوئی بات کرنا چاہے تو ان ڈبیوں کے ذریعے کر سکتا ہے۔ بس تھوڑی سی حرارت پہنچانی ہو گی جو کسی سلگتے ہوئے سگرٹ سے بھی پہنچائی جا سکتی ہے۔ بس مجھے اسی قدر کہنا تھا۔"

آواز آنی بند ہوگئی۔ ایک بار پھر جھنجھناہٹ کی آواز گونجی اور آواز کے ختم ہوتے ہی ڈبیوں کی سُرخی غائب ہوگئی۔

میدانی علاقے میں گھوڑے پر سواری کرنے اور پہاڑی علاقے میں سواری کرنے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ انھیں سخت دشواری پیش آرہی تھی۔ تنگ پہاڑی پگ ڈنڈی پر چلتے وقت انھیں یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اب گھوڑا بدکا، اب وہ کسی کھائی میں گرے۔

سب سے آگے کامران مرزا اور منوّر علی خاں تھے ان کے پیچھے آفتاب، آصف اور فرحت، اور پھر فضلو۔ کامران مرزا نے کوئی اور آدمی ساتھ لینا پسند نہیں کیا تھا اگرچہ منوّر علی خاں نے انھیں مشورہ دیا تھا کہ دو چار ملازم ساتھ لے لینے چاہئیں، جو پہاڑی راستوں پر ان کی رہنمائی کریں، لیکن کامران مرزا نے انکار کر دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ہو سکتا ہے، اس طرح دشمن کا کوئی آدمی ہمارے ساتھ مل جائے۔

آفتاب نے ان کے ہوٹل میں واپس آنے کے بعد سنہری ڈبیوں کے ذریعے موصول ہونے والا پیغام انھیں

سُنا دیا تھا۔ وہ مسکرا کر رہ گئے تھے اور صرف اتنا کہا تھا:

"وہ ہمیں خوف زدہ کرنا چاہتا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ ڈبیاں بم کی طرح پھٹ سکتی ہوں۔ لیکن تم فکر نہ کرو۔ میں پہاڑی علاقے میں پہنچ کر ان سے نجات حاصل کر لوں گا۔"

اس وقت بھی وہ اسی کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔ دُور دُور تک بھوری پہاڑیوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ ہریالی نام کو بھی نہ تھی۔ ہزاروں فٹ گہری کھائیوں کی طرف دیکھنے سے ہی خوف آتا تھا۔

اچانک کامران مرزا اور منوّر علی خاں کے گھوڑے ٹھٹک کر رُک گئے تھے۔ پھر وہ اگلے پیر اُوپر اٹھا کر کھڑے ہو گئے۔ فوراً ہی بعد ان کے گھوڑے نے بھی یہی کیا۔

"فوراً گھوڑوں سے نیچے اُتر آؤ۔" منوّر علی خاں چیخے

وہ بوکھلاہٹ کے عالم میں نیچے اُتر پڑے، البتہ گھوڑوں کی باگیں انھوں نے تھامے رکھیں کہ کہیں بھڑک کر بھاگ نہ کھڑے ہوں۔ معاملہ ابھی تک ان کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

"کیا بات ہے انکل؟ یہ گھوڑوں کو کیا ہوا؟" آفتاب نے پوچھا۔

"میری زندگی کے تجربات مجھے بتا رہے ہیں کہ آس پاس کوئی زہریلا کیڑا یا کوئی درندہ موجود ہے۔"

"لیکن ان خشک پہاڑیوں پر درندہ کہاں سے آگیا؟" کامران مرزا نے اعتراض کیا۔

"تمھاری بات ٹھیک ہے، لیکن کوئی کیڑا تو ضرور ہو سکتا ہے۔"

"لیکن گھوڑوں کو اس کا پتا کیسے چل گیا؟" آصف نے پوچھا۔

"میں کہہ نہیں سکتا کہ وہ کون سا کیڑا ہوگا۔ گھوڑے کو قدرت نے خطرات کی بُو سونگھنے کی طاقت عطا فرمائی ہے۔ خاص طور پر زہریلے کیڑوں اور درندوں کا تو اسے دُور سے ہی پتا چل جاتا ہے۔ یہ زیادہ تر سانپ اور شیر سے گھبرا کر اس طرح بدکتا ہے۔"

"تو کیا آگے کوئی سانپ ہے؟"

"ہاں۔ میرا تو یہی خیال ہے۔" وہ بولے۔

"پھر اب کیا ہوگا؟"

"گھوڑے اس وقت تک آگے نہیں بڑھیں گے جب

تک اسے ختم نہ کر دیا جائے۔" منوّر علی خاں بولے "اور یہ کام میں کروں گا۔"

"نہیں منوّر علی خاں، میں تمھارے ساتھ چلوں گا۔"

"پر گھوڑوں کو کون سنبھالے گا؟ میں کہتا ہوں، تم سب یہیں ٹھہرو، میں اکیلا ہی کافی ہوں۔ بے فکر رہو۔ مجھے سانپ کا شکار آتا ہے، بلکہ کہو تو اُسے زندہ پکڑ لاؤں۔"

اچانک آصف چونک اٹھا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ آفتاب اور فرحت نے اس کی طرف حیران ہو کر دیکھا۔ وہ سامنے کافی فاصلے پر سڑک کو دیکھ رہا تھا۔

"کیا اس سڑک میں سے کسی خزانے کے برآمد ہونے کی اُمّید ہے؟" فرحت نے کہا۔ "یا یہ سڑک پرستان کو جاتی ہے کہ تم اس طرح گھور رہے ہو؟"

"وہ دیکھو، وہ ... سڑک پر کیا چیز چلی آرہی ہے" اس نے انگلی سے اشارہ کیا۔

انھوں نے ایک ساتھ سڑک پر دیکھا۔ منوّر علی خاں بُری طرح چونکے۔ اسی وقت گھوڑوں نے پیچھے کھسکنا شروع کر دیا۔ وہ اُلٹے پیروں چل رہے تھے۔ وہ

سب ان کی باگوں کو مضبوطی سے پکڑ کر کھینچنے لگے لیکن ایک انچ بھی آگے نہ کھینچ سکے۔ گھوڑے جم کر کھڑے ہو گئے تھے۔

"یہ تو کوئی مینڈک نظر آتا ہے۔" فرحت نے کہا۔

"ہاں، سنہری مینڈک۔" آصف کے منہ سے نکلا۔

"یہ مینڈک نہیں، پہاڑی بچھو ہے۔" منور علی خاں نے کہا۔

بچھو ناچتے ہیں

"پہاڑی بچھو!" وہ ایک ساتھ چلائے۔

انھوں نے اپنی زندگی میں کبھی پہاڑی بچھو نہیں دیکھے تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ یہ اس قدر بڑے ہوں گے۔ ابھی وہ دم بخود کھڑے اسے دیکھ رہے تھے کہ ایک رونگٹے کھڑے کر دینے والا منظر انھوں نے دیکھا۔ اس بچھو سے کچھ فاصلے پر آٹھ دس بچھو اور چلے آ رہے تھے۔

گھوڑے پیچھے ہٹنے کے لیے زور لگا رہے تھے انھیں سنبھالنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ اچانک فرحت کے ہاتھ سے باگ چھوٹ گئی۔ اس کا گھوڑا بھڑک کر مڑا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ بس پھر کیا تھا، دوسرے گھوڑوں نے بھی زوردار جھٹکوں سے باگیں چھڑا لیں اور سرپٹ دوڑنے لگے۔ کامران مرزا اور منور علی خاں بھی اپنے گھوڑوں کو نہ روک سکے۔

"افسوس! گھوڑے ہاتھ سے گئے۔" منوّر علی خاں نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"اس وقت مسئلہ گھوڑے پکڑنے کا نہیں، ان بچھوؤں سے نبٹنے کا ہے۔"

"انھیں پتھر مار کر یا فائر کر کے ہلاک نہیں کیا جا سکتا؟" آفتاب نے پوچھا۔

"ضرور کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس میں خطرہ بھی ہے ان بچھوؤں کے جسم میں زہر بھرا ہوتا ہے۔ اگر ہم پتھر مار کر انھیں ہلاک کرنے کی کوشش کریں گے تو زہر کے چھینٹے ہم میں سے کسی کے جسم پر پڑ سکتے ہیں۔ میں یہ بھی بتا دوں کہ ان کا زہر اس قدر تیز ہوتا ہے کہ جسم کے جس حصّے پر گرتا ہے وہاں فوراً آبلہ سا بن جاتا ہے اور دوسرے ہی لمحے آدمی مر جاتا ہے۔ کہنے کو تو یہ صرف بچھو ہیں لیکن در حقیقت یہ ناگ سے بھی زیادہ خطرناک ہیں۔ ان کی رفتار بھی بہت تیز ہوتی ہے۔ چک پھیریاں کاٹتے وقت تو یہ بہت ہی خوفناک لگتے ہیں۔" یہ کہہ کر منوّر علی خاں خاموش ہو گئے۔

بچھو اب انھیں صاف نظر آنے لگے تھے۔ ان کا

رنگ بالکل سبز تھا اور مڑے ہوئے ڈنک سُتلی جتنے موٹے تھے۔ انھوں نے اپنے جسموں میں سنسنی سی دوڑتی محسوس کی۔

"پھر ہم انھیں کیسے ماریں گے؟" کامران مرزا نے کہا "ہم انھیں پستول کے فائر کر کے ختم کر سکتے ہیں لیکن اس صورت میں بھی زہر کے چھینٹے ہم میں سے کسی پر پڑنے کا خطرہ ہے۔ سب سے محفوظ طریقہ انھیں ختم کرنے کا یہ ہے کہ ان پر کوئی جلتی ہوئی چیز پھینک دی جائے، لیکن ہم ایسی کسی چیز کا بندوبست نہیں کر سکتے۔"

"میرا دستی بموں والا تھیلا بھی گھوڑے کے ساتھ ہی چلا گیا، ورنہ ہم کافی فاصلے پر جا کر ان پر بم مار سکتے تھے۔ پستول سے، دور جا کر، فائر کریں تو نشانہ ٹھیک نہیں بیٹھے گا۔"

"گیس پستول۔" ایک دم آفتاب کے منھ سے نکل گیا۔ وہ سب چونک اٹھے۔ گیس پستولوں کے بارے میں تو وہ بالکل ہی بھول گئے تھے۔ واقعی وہ ان بچھوؤں کو گیس پستول سے نہایت آسانی سے مار سکتے تھے۔

مجھے افسوس ہے، یہ ترکیب میرے ذہن میں

کیوں نہ آئی؟" آصف نے کہا۔

"اور مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ ہم اس تدبیر سے بھی ان سے نجات حاصل نہیں کر سکتے۔" کامران مرزا نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"تینوں پستول میرے بیگ میں رکھے تھے۔ میرا گھوڑا اسے بھی ساتھ لے گیا۔"

"اوہ!" آفتاب نے کہا۔ اسی وقت ایک خوفناک دھماکا ہوا۔ پل بھر کو پہاڑیاں لرز سی گئیں۔ انھیں یوں لگا جیسے زلزلہ آگیا ہو۔ بوکھلا کر ادھر ادھر دیکھا۔ یہ زلزلہ نہیں تھا۔ دوسرے ہی لمحے انھوں نے ایک خوفناک منظر دیکھا۔ دور، بہت دور سینکڑوں فٹ گہری کھائی میں ایک گھوڑا گرتا جا رہا تھا۔ اس کے جسم کے حصے فضا میں اڑ کر نیچے گر رہے تھے۔

"یہ کیا ہوا؟" منوّر علی خاں بولے

"شاید بم پھٹے ہیں۔" فرحت نے جلدی سے کہا۔

"نہیں۔ دستی بموں سے یہ پہاڑ نہیں لرز سکتے۔ ضرور کوئی اور بات ہوئی ہے۔" کامران مرزا نے کہا۔

"ابا جان، کہیں یہ ... وہی سنہری ڈبیاں تو نہیں

پھٹیں؟" آفتاب نے کہا۔

"اوہ! ضرور یہی بات ہے۔ شاید گھبراہٹ میں گھوڑے کا پاؤں پھسل گیا ہو گا۔ اس کے گرنے سے ڈبیاں پھٹ گئیں۔"

"خیر، ان کی تو کوئی بات نہیں۔ انھیں تو میں خود ہی پھینک دینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ مگر مجھے یہ خیال تک نہیں آیا تھا کہ یہ ڈبیاں اس قدر خوفناک ہو سکتی ہیں۔ میں تو انہیں بس ٹرانسمیٹر قسم کی چیز سمجھا تھا۔"

"ارے! ہم ان بچھوؤں کو تو بھول ہی گئے۔" منوّر علی خاں نے کہا۔

سب نے چونک کر سڑک کی طرف دیکھا۔ بچھو ایک جگہ ساکت نظر آ رہے تھے۔ شاید ان پر بھی دھماکے کا اثر ہوا تھا۔

"معلوم ہوتا ہے، یہ ختم ہو گئے۔" فرحت نے کہا۔

"نہیں۔ دھماکے کی وجہ سے انھوں نے چکر کاٹنا بند کر دیا ہے۔ ابھی ان کے حواس بجا ہوں گے تو پھر چکرانے لگیں گے۔" منوّر علی خاں نے بتایا۔

"تو پھر کیوں نہ انھیں اسی حالت میں ختم کر دیا جائے؟" کامران مرزا جلدی سے بولے۔

"ہاں۔ اب ہمیں کچھ پیچھے ہٹ کر ان پر فائرنگ شروع کر دینی چاہیے۔ چلو کامران مرزا، جلدی شروع کرو۔"

دونوں نے اپنی جیبوں سے پستول نکال لیے اور بیک وقت دو فائر کیے۔ انھوں نے دو بچھوؤں کو اپنی جگہ سے غائب ہوتے دیکھا۔ شاید ان کی دھجیاں اُڑ گئی تھیں لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے ایک حیرت ناک منظر بھی دیکھا۔ فائروں کے ہوتے ہی بچھوؤں نے تیزی سے حرکت کرنا شروع کر دی۔ اب وہ اس طرح چکّر کاٹ رہے تھے کہ کامران مرزا اور منوّر علی خاں کو نشانہ لینے میں مُشکل پیش آنے لگی۔ اور جب اُنھوں نے دوبارہ فائر کیے تو وہ خطا گئے۔ اس کے ساتھ ہی بچھو سیدھے ان کی طرف آنے لگے۔

وہ گھبرا گئے۔ منوّر علی خاں پوری قوت سے چلائے
"کامران مرزا! تم بچوں اور فضلو کو لے کر پیچھے ہٹتے چلے جاؤ۔ میں ان کا مقابلہ کرتا ہوں۔"

"لیکن تم تنہا ان کا مقابلہ کیسے کرو گے؟" کامران مرزا نے کہا۔

"فکر نہ کرو۔ میری ساری زندگی شکار میں گزری ہے

ہے میں ان سے دست بدست لڑائی لڑوں گا۔"

"دست بدست؟ یعنی تم ہاتھوں سے لڑو گے؟"
کامران مرزا چلائے۔

"ہاں۔ ہاتھوں سے بھی اور پیروں سے بھی۔ بس تم مزے سے یہ جنگ دیکھنا۔"

"میں اس جنگ میں تمھارا ساتھ دوں گا۔ بچے اور فضلو پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔" کامران مرزا نے کہا۔

"دیکھو کامران مرزا، یہ وقت باتوں کا نہیں۔ بچھو لمحہ بہ لمحہ نزدیک آتے جا رہے ہیں۔ تم شکار کا تجربہ نہیں رکھتے۔ کیڑے مکوڑوں کی عادات سے واقف نہیں۔ خدا کے لیے جو میں کہہ رہا ہوں، وہی کرو۔"

کامران مرزا ان کی بات ماننے پر مجبور ہو گئے اور سب کے ساتھ پیچھے ہٹتے چلے گئے۔ منوّر علی خاں اپنی جگہ تنے کھڑے تھے۔ بچھو لمحہ بہ لمحہ ان کے نزدیک آتے جا رہے تھے۔

دوسرے سب خوف زدہ نظروں سے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ اب منوّر علی خاں بچھوؤں پر فائر نہیں کر سکتے تھے، اس لیے انھوں نے پستول جیب میں رکھ لیا۔ انھوں نے دیکھا، ان کی طرف

بڑھنے والے بچھوؤں کی تعداد گیارہ تھی۔

اچانک گیارہ کے گیارہ بچھوؤں نے ان پر حملہ کر دیا۔

منوّر علی خاں کی کوشش یہ تھی کہ کوئی بچھو ان کے پاؤں کے نیچے دب نہ جائے کیوں کہ اس طرح زہر ان کے جسم پر گر سکتا تھا۔ انھوں نے اُچھل کر ایک طرف ہٹتے ہوئے ایک بچھو کو جوتے کی نوک پر فٹ بال کی گیند کی طرح اُچھال دیا۔ بچھو ہوا میں اُچھلا اور کھائی کی طرف گرنے لگا۔

یہ کام اس خوب صورتی سے ہوا کہ کامران مرزا حیران رہ گئے۔ اتنی دیر میں منوّر علی خاں اُچھل کر دو بچھوؤں کو اور اُچھال چکے تھے۔

اچانک کامران مرزا گھبرا گئے۔ ایک بچھو چکّر کاٹ کر منوّر علی خاں کی زد سے بچ نکلا تھا اور ان کی بے خبری میں پیچھے سے ان کی ٹانگ پر ڈنک مارنے والا تھا کامران مرزا نے بلا کی تیزی سے اپنی جگہ سے چھلانگ لگائی اور آن کی آن میں منوّر علی خاں کے پیچھے پہنچ گئے دوسرے ہی لمحے انھوں نے منوّر علی خاں کے طریقے پر عمل کرتے ہوئے اس بچھو کو کھائی کی طرف اُچھال دیا

اب انھوں نے اپنی کمر منوّر علی خاں کی کمر سے ملا لی اور اس طرح دونوں بچھوؤں کا مقابلہ کرنے لگے۔ جلد ہی میدان صاف ہو گیا۔ انھوں نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملائے اور بچوں اور فضلو کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ اب یہ قافلہ پیدل روانہ ہوا۔ سب پیدل تو تھے ہی، خالی ہاتھ بھی تھے کیوں کہ تمام سامان گھوڑے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ ان میں اب اتنی ہمت نہ تھی کہ واپس گھوڑوں کی تلاش میں جائیں۔ یوں بھی اب گھوڑوں تک پہنچنا پہاڑی راستوں پر ناممکن تھا۔ انھوں نے گھوڑوں اور سامان کے خیال کو ذہن سے جھٹکا اور آگے روانہ ہوئے۔ لیکن اچانک آفتاب کے منھ سے یہ جملہ نکل گیا

"اوہ! اب کیا ہو گا؟"

"کیا مطلب؟ تمھارا اشارہ کس طرف ہے؟" آصف نے پوچھا۔

"ہم سب ایک اہم بات بھول رہے ہیں۔ کھانے پینے کی تمام چیزیں بھی گھوڑوں کے ساتھ جا چکی ہیں۔" آفتاب نے بتایا۔

وہ سب سکتے کے عالم میں سڑک پر کھڑے رہ گئے

"اُف میرے خدا! واقعی، آفتاب ٹھیک کہہ رہا ہے

"اب کیا ہو گا؟" منوّر علی خاں نے بوکھلا کر کہا۔

"وہی ہو گا جو منظورِ خدا ہو گا۔" کامران مرزا مسکرائے

انھیں کامران مرزا کی یہ مسکراہٹ بہت عجیب لگی اس وقت جب کہ ان کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں کامران مرزا مسکرا رہے تھے۔

"آپ اس وقت بھی مسکرا سکتے ہیں؟"

"ہاں، خدا ہر جگہ موجود ہے اور جب وہ ہر جگہ موجود ہے تو پھر مایوس ہونے کی کیا ضرورت ہے۔" انھوں نے جواب دیا۔

"لیکن ... ایسی بے آباد جگہ سے، جہاں میلوں تک کوئی انسان نظر نہیں آتا، کھانے کی کوئی چیز کیسے مل سکتی ہے؟"

ایک گھنٹے اور سفر کرنے کے بعد سڑک ختم ہو گئی وہ پہاڑ کی اونچائی تک پہنچ چکے تھے۔ اب اُترائی شروع ہوئی۔ پہاڑ سے اُترنا اگرچہ چڑھنے کی نسبت کم مشکل تھا لیکن خطرناک بھی تھا۔ کسی وقت بھی ان کا قدم غلط جگہ پڑ سکتا تھا اور وہ لڑھکتے ہوئے نیچے جا سکتے تھے۔

دُور ... نیچے ... بہت نیچے ... کامران مرزا کو کوئی سبز سی چیز نظر آئی۔

"وہ دیکھو! درخت۔" وہ چلّائے۔ سب نے نیچے دیکھا۔ واقعی، وہاں ہریالی موجود تھی۔

"یہاں ضرور کھانے کی کوئی چیز مل جائے گی۔ ہو سکتا ہے پانی بھی مل جائے۔" منوّر علی خاں بولے۔

ہریالی کو دیکھ کر ان کی ہمّت بندھی اور وہ سنبھل کر پہلے سے تیز قدم اٹھانے لگے۔ لیکن انھیں معلوم تھا کہ وہ جگہ، جہاں انھیں ہریالی نظر آرہی تھی، اس جگہ سے کتنی دور تھی۔

سُورج غروب ہونے لگا تھا۔ وہ ابھی تک اس جگہ سے بہت فاصلے پر تھے۔ رات سر پر آرہی تھی اور ان کے پاس سونے کے لیے ایک بستر بھی نہ تھا۔ دوسرے یہ خطرہ بھی تھا کہ کہیں کوئی سوتے میں نیچے نہ لُڑھک جائے۔ وہ اندھیرے میں سفر بھی جاری نہیں رکھ سکتے تھے۔

آخر اُنھوں نے آرام کرنے کا فیصلہ کیا اور ایک مناسب سی جگہ دیکھ کر رُک گئے۔ کامران مرزا نے کہا کہ وہ آدھی رات تک جاگتے رہیں گے۔ پھر منوّر علی خاں کو جگا دیں گے۔ اس طرح رات کا باقی حصّہ وہ جاگ کر گزاریں گے تا کہ ان میں سے کوئی

نیچے تو گزر سکے۔

وہ سب سونے کی کوشش کرنے لگے۔ سب کو بھوک محسوس ہو رہی تھی، کیونکہ شام کا ناشتا کرنے کے بعد بچھوؤں نے ان کا راستہ روک لیا تھا۔ رات کا کھانا انھیں نصیب نہیں ہوا تھا۔ یہ ان کی زندگی میں پہلی رات تھی، جب وہ بھوکے سو رہے تھے۔

سُرخ وادی میں

صبح سویرے ان کی آنکھ کھل گئی۔ انھوں نے دیکھا، کامران مرزا نماز پڑھ رہے ہیں۔ وہ بھی تیمم کرکے نماز پڑھنے لگے۔ دُعا سے فارغ ہو کر انھوں نے ایک بار پھر سفر شروع کیا۔ اب ان کی آنتیں قُل ہُو اللّٰہ پڑھنے لگی تھیں۔ رات تو کسی نہ کسی طرح گزر گئی تھی لیکن اب بھوکے پیٹ آگے بڑھنا بہت مشکل تھا دوسری طرف ان کا اس ہریالی تک پہنچنا بہت ضروری تھا، ورنہ وہ ان پہاڑوں کے درمیان بھوکے ہی مر جاتے

کامران مرزا برابر ان کی ہمت بڑھا رہے تھے۔ وہ سب سے آگے چل رہے تھے۔ منوّر علی ان کے پیچھے تھے۔ ان کے بعد بچّے اور فضلو۔ ہریالی ابھی تک بہت دُور تھی۔ وہ اس کی طرف دیکھتے تو یوں لگتا جیسے وہ ساری عمر چلتے رہنے کے بعد بھی اس تک نہ پہنچ سکیں گے۔

دوپہر ڈھلنے تک ان کی حالت بہت خستہ ہو گئی اب ان کے قدم بہت سستی سے اٹھ رہے تھے ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں۔ آنکھوں میں مایوسیاں تیرنے لگی تھیں۔ ایک کامران مرزا تھے جو ابھی تک خوش خوش بڑھتے جا رہے تھے اور انھیں بھی آگے بڑھتے رہنے کے لیے کہہ رہے تھے۔

اچانک فضلو لڑکھڑا گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ گرا اور گر کر لڑھکنے لگا۔ ساتھ ہی اس کے منھ سے ایک چیخ نکل گئی۔ سب نے گھبرا کر پیچھے دیکھا۔ فضلو چونکہ سب سے پیچھے تھا، اس لیے وہ لڑھکتا ہوا ان کی طرف آ رہا تھا۔ کامران مرزا گھبرا اٹھے۔ انھوں نے سوچا، کہیں فضلو بچوں میں سے کسی سے نہ ٹکرا جائے اور وہ بھی اس کے ساتھ نہ لڑھکنے لگے۔ انھوں نے چیخ کر کہا:

" آفتاب! آصف! ایک طرف ہٹ جاؤ۔ فضلو کو میں سنبھال لوں گا۔"

لیکن اتنی دیر میں آفتاب فضلو کو لڑھکنے سے روکنے کے لیے قدم بڑھا چکا تھا۔ وہ نیچے جھک گیا۔ عین اسی وقت فضلو اس تک پہنچ گیا۔ وہ

بہت بھاری بھرکم تھا۔ آفتاب نے اسے سنبھالنے کے لیے پوری قوت صرف کر دی اور اس کوشش میں وہ خود بھی ڈگمگا گیا۔ عین اسی وقت کامران مرزا اور منور علی خاں وہاں پہنچ گئے۔ انھوں نے جلدی سے دونوں کو تھام لیا۔

چند منٹ بعد وہ کھڑے ہوئے گہرے گہرے سانس لے رہے تھے۔ سب تھکن سے نڈھال تھے۔ ایک بار پھر کامران مرزا نے ان کی ہمت بندھائی:

" اب ہم ہریالی سے دور نہیں ہیں۔ اگر ہم نے وہاں تک پہنچنے کے لیے جدوجہد نہ کی تو یہیں ایڑیاں رگڑتے مر جائیں گے، اور کوئی ماتم کرنے والا بھی نہ ہو گا۔"

مثل مشہور ہے، ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا۔ سورج غروب ہونے سے تین گھنٹے پہلے وہ ہریالی کے نزدیک پہنچ گئے۔ پہاڑ کے دامن میں یہ ایک ہرا بھرا تختہ تھا۔ اس تختے تک پہنچتے ہی انھوں نے ایک دم یہ محسوس کیا کہ جہنم سے نکل کر جنت میں آ گئے ہیں بھوک سے بے دم ہو رہے تھے، اس لیے سب سے پہلے کھانے کی کسی چیز کی تلاش میں نظریں دوڑانے لگے یہ دیکھ کر ان کی جان میں جان آئی کہ وہاں چند درختوں

میں پھل لٹک رہے ہیں۔ منوّر علی خاں کچھ کہے بغیر ایک درخت کی طرف بڑھ گئے اور بندر کی سی پھرتی سے اس پر چڑھنے لگے۔ سب کی نظریں ان پر جمی تھیں۔

صرف دو منٹ میں منوّر علی خاں اُوپر پہنچ گئے۔ انھوں نے بہت سے پھل توڑ کر نیچے گرا دیے۔ پھر خود بھی نیچے اُتر آئے۔ پھل کے گودے کا مزا نمکین تھا۔ مگر بھوکوں کو اس وقت یہ عجیب وغریب اور بدمزہ پھل دنیا جہان کی نعمتوں سے لذیذ لگے۔ وہ مربھکّوں کی طرح کھانے لگے۔

انھوں نے خوب پیٹ بھر کر پھل کھائے۔ اب ان پر نیند سوار ہونے لگی۔ بھوکا آدمی پیٹ بھر کر کھائے تو اسے زور کی نیند آنے لگتی ہے۔ لیکن اچانک ان کی نیند ہوا ہو گئی۔ وہ ہکّا بکّا رہ گئے۔ کھانے پینے کے چکّر میں وہ اپنے اردگرد کا خیال رکھنا بھول گئے تھے۔

انھوں نے دیکھا، وہ چاروں طرف سے گھِر چکے تھے۔

انھیں گھیرے میں لینے والوں کی تعداد پچاس

کے قریب تھی۔ ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں سُرخ تیر پھینکنے والی نلکیاں تھیں۔ ان نلکیوں کے سوراخوں میں سے تیروں کے سرے جھانک رہے تھے۔ گھیرا اس قدر تنگ تھا کہ وہ کسی طرف سے بچ کر نہیں جا سکتے تھے۔

سب نے کامران مرزا کی طرف دیکھا۔ وہ دبے دبے انداز میں مسکرا رہے تھے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہے تھے:

"خبردار! تم میں سے کوئی حرکت نہ کرے۔"

اچانک ان میں سے ایک بولا۔ "تم سب سُرخ وادی کے مہمان ہو۔ ہم تمھیں وہاں لے جائیں گے کیوں کہ تو تم ہزار سال تک بھی وہاں نہیں پہنچ سکتے"

"بہت خوب! کیا سُرخ وادی یہاں سے نزدیک ہی ہے" آفتاب نے خوش ہو کر پوچھا۔

"ہاں۔ ہمارے لیے بہت نزدیک ہے لیکن تمھارے لیے اب بھی ہزاروں میل دور ہے"

"تو پھر تو تم ہی ہمیں لے چلو۔ ہم سفر کرتے کرتے تنگ آ چکے ہیں" آصف بولا۔

"اب تمھیں سفر نہیں کرنا پڑے گا۔"

"بھئی واہ! مزا آگیا!" فرحت چہکی۔

"ابھی اور مزا آئے گا" اس نے ہنس کر کہا۔

"اچھا! وہ کیسے؟ کیا سُرخ وادی میں کھانے پینے کی چیزیں ہیں؟" آفتاب نے پوچھا

"ہاں۔ ہم یہ بد مزہ پھل کھا کر اُکتا گئے ہیں" فرحت بولی۔

"فکر نہ کرو۔ وہاں تمھیں بہت کچھ ملے گا"

"تمھارا بہُت بہُت شکریہ، دوست۔ اب ہمیں جلدی سے لے چلو۔ ہم اور انتظار نہیں کر سکتے" آصف نے بے چین ہو کر کہا۔

"ٹھیک ہے۔ لیکن وہاں جانے سے پہلے سُرخ موت کی وادی کا پہلا تحفہ تو دیکھ لو" یہ کہہ کر اس نے جیب میں سے مُٹھی بھر کر، کوئی چیز نکالی۔ جب اُس نے مُٹھی کھولی تو اس میں سفید رنگ کا کوئی پوڈر نظر آیا۔

"ارے! یہ کیا ہے؟"

"ابھی معلوم ہو جاتا ہے"

یہ کہہ کر اس نے پوڈر ان کی طرف اُچھال دیا۔ وہ حیرت انگیز تیزی سے غبار کی شکل میں تبدیل ہو

گیا، اور اتنا گہرا ہو گیا کہ اس کے آر پار کچھ نہیں دکھا جا سکتا تھا۔ اس سفید غبار نے انھیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ اس میں چھُپ کر رہ گئے۔ جب غبار چھٹا تو وہ بے ہوش پڑے تھے۔

انھیں کئی گھنٹے بعد ہوش آیا۔ بہت دیر تک تو وہ سمجھ ہی نہ سکے کہ انھیں کیا ہوا ہے۔ آخر رفتہ رفتہ یاد آگیا کہ وہ سفر کرتے کرتے ایک سرسبز تختے تک پہنچ گئے تھے، جہاں وہ گھیر لیے گئے اور پھر سفید غبار میں بے ہوش ہو گئے۔ انھوں نے بوکھلا کر آنکھیں کھولیں۔

وہ اب اس تختے پر نہیں تھے۔ ان درختوں اور پودوں کا کہیں پتا نہ تھا۔ نہ ان کے گرد سفید غُبار پھیلا ہوا تھا۔ کچھ دیر تک وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک دُوسرے کو دیکھتے رہے۔ ان کی نظریں سوال کر رہی تھیں، ہم کہاں ہیں؟

اور پھر ایک دم وہ چونک اُٹھے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے جو دُھند سی چھا گئی تھی، اب صاف ہو گئی تھی۔ انھوں نے دیکھا، وہ سُرخ رنگ کی پتھریلی زمین پر پڑے ہیں۔ ان کے چاروں طرف، کافی فاصلے پر،

سُرخ پہاڑ ہی پہاڑ ہیں۔ انھیں ہر طرف سُرخ رنگ ٹھاٹھیں مارتا نظر آیا۔

ایک طرف انھیں کارخانوں کی قسم کی چند عمارتیں نظر آئیں۔ دوسری طرف بے شمار چھوٹے چھوٹے گھر بنے تھے۔ ابھی تک انھیں کوئی انسان نظر نہیں آیا تھا، اچانک وادی میں ایک آواز گونجی:

"یہی سُرخ موت کی وادی ہے۔ اس وادی کے چپّے چپّے پر موت کا راج ہے۔ اُٹھو! میں تمھیں پہلے اس وادی کی سیر کرا دوں، پھر اپنے پاس بلا کر کچھ چیزیں دکھاؤں گا۔"

آواز آنی بند ہو گئی۔ یہ وہی آواز تھی جسے وہ پہلی مرتبہ زمین دوز دنیا میں اور دوسری مرتبہ ہوٹل کوثری ستار میں سُن چکے تھے۔

کامران مرزا ایک دم کھڑے ہو گئے۔ ان کے ساتھ دوسروں نے بھی اُٹھنے میں دیر نہیں لگائی۔

"سیدھے چلے آؤ!" آواز نے انھیں ہدایت کی۔

وہ چلنے لگے۔ زمین بہت سخت تھی۔ ہر طرف سنّاٹا تھا، جیسے وہ کسی قبرستان میں سے گزر رہے تھے۔ پندرہ منٹ تک چلتے رہنے کے بعد انھیں وادی میں کچھ

تبدیلی نظر آئی۔ وادی میں لاتعداد پودے اُگے تھے۔ ان پودوں میں پتے نہیں تھے۔ پھول بھی نہیں تھے صرف کانٹے تھے۔ لمبے لمبے کانٹے۔ یہ پودے سُرخ رنگ کے تھے۔

"ان پودوں کو دیکھ رہے ہو؟" آواز پھر گونجی "یہ یہاں کی قدرتی پیداوار ہے۔ ان کانٹوں کی نوکوں پر موت موجود ہے۔ تم نے کبھی کانٹے کو چھُوا اور گرے۔ یہی وہ کانٹے ہیں، جن سے ہم سُرخ تیر بناتے ہیں۔"

یہ سُن کر وہ حیرت زدہ رہ گئے۔ آواز ان سے کہہ رہی تھی "اب اور آگے بڑھو!"

وہ پھر چلنے لگے۔ تھوڑے ہی فاصلے پر انھوں نے ٹُنڈ مُنڈ چھوٹے چھوٹے درخت دیکھے۔ ان درختوں پر گوند کی قسم کی کوئی چیز تہ در تہ جمی ہوئی تھی۔ وہ ابھی ان درختوں کو حیران ہو کر دیکھ ہی رہے تھے کہ آواز نے کہا:

"اور یہی درخت سُرخ موت کے درخت ہیں۔ ہم لوہے کے چھلّوں پر اس گوند کی صرف ایک رتّی کا دسواں حصّہ لگا دیتے ہیں۔ چھلّے کی نوک جسم میں چُبھنے کی دیر

ہے کہ وہ شخص سُرخ موت کا شکار ہو جائے گا۔ میں تمھیں یہ منظر ضرور دکھاؤں گا۔ اس وادی میں بھی ایک غدّار موجود ہے۔ وہی غدّار جس نے ییشوما کو یہاں سے بھاگنے میں مدد دی تھی۔ وہ اس وقت سے قید خانے میں پڑا سڑ رہا ہے۔ میں نے سوچا تھا، اُسے تم لوگوں کے سامنے ہی سُرخ موت کا شکار بنایا جائے تاکہ تم بھی دیکھ لو کہ ایک غدار کو یہاں کیا سزا ملتی ہے۔ اور آگے بڑھو۔"

اب ایک چٹان ان کے سامنے تھی۔ پوری وادی میں صرف یہ بھُورے رنگ کی تھی۔ وہ اس سُرخ وادی میں بہت عجیب لگ رہی تھی۔

"اس چٹان کے پتھر بھُربھُرے ہیں۔ جب انھیں گرم کیا گیا تو اس میں سے گیس خارج ہونے لگی۔ اس گیس نے آس پاس کے تمام جانداروں، تمام مخلوق کو ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں ختم کر دیا اور اس طرح میرے بہت سے تجربہ کرنے والے سائنسدان ختم ہو گئے۔ کیوں کہ اس وقت تک انھیں بھی اس کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔ بعد میں ایک چیز ایجاد کی گئی۔ اس کے استعمال سے ہم گیس سے محفوظ ہو گئے۔ پھر اس

گیس کے لیے پستول بنائے گئے۔ گیس کو ان میں بھر کر تجربہ کیا گیا۔ تجربہ حیرت انگیز حد تک کامیاب رہا۔ ایک پستول کا ایک فائر ایک ہزار آدمیوں کو صرف ایک سیکنڈ میں ختم کر سکتا ہے۔ لیکن ابھی ہم ان پستولوں میں بہت ہلکی گیس بھر رہے ہیں۔ اگر تم کوئی سوال کرنا چاہو تو کر سکتے ہو۔ میں نہ صرف تمھاری آواز سن سکتا ہوں بلکہ تمھیں دیکھ بھی رہا ہوں۔"

"آخر اس سارے کھیل کا مقصد کیا ہے؟" کامران مرزا نے پوچھا۔

"ہاں، یہ سوال بہت اہم ہے۔ یہ سوال یہاں رہنے والوں اور دوسرے اڈوں پر کام کرنے والوں، سب کے ذہن میں گونجتا رہتا ہے۔ لیکن آج تک یہ کسی کو بھی نہیں معلوم۔ البتہ میں تم لوگوں کو ضرور بتاؤں گا۔"

"لیکن ییشوما کو کیسے معلوم ہو گیا تھا؟" آفتاب نے پوچھا۔

"اسی غدار کی وجہ سے۔ دراصل اسے سب کچھ معلوم تھا۔ اس سے میں نے بہت کام لیا ہے۔ وہ ایک بہت بڑا سائنس دان ہے۔ مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ سارے پروگرام سے اسے باخبر کر دیا۔ بس

وہ باغی ہو گیا۔ لیکن یہ بات اس نے اپنے دل میں رکھی اس کا علم تو یشوبا کے فرار ہونے پر ہوا۔ دراصل اس وادی کا سارا انتظام اسی کے ہاتھ میں تھا۔ یہاں کے خفیہ راستوں کا علم بھی صرف اسے اور مجھے تھا۔"

"آخر وہ باغی کیوں ہو گیا؟" فرحت نے سوال کیا۔

"بس، اسے میری سکیم پسند نہیں آئی۔ وہ دل میں اس کا مخالف ہو گیا۔ مجھ پر ظاہر نہیں کیا۔"

"چلو، اب بھی بتا دو کہ وہ سکیم کیا ہے۔" منور علی خان نے اُکتا کر کہا۔

"ضرور بتاؤں گا، لیکن ابھی نہیں۔"

"میں جانتا ہوں۔ تم ہمارے دشمن ملک کے لیے کام کر رہے ہو۔ آخر تم لوگ چاہتے کیا ہو؟" کامران مرزا نے کہا۔

"اگر یشوبا یہاں سے نہ نکل بھاگا ہوتا تو بہت جلد تمہیں اس بات کا علم ہو جاتا۔ لیکن یہ اس وقت ہوتا جب ہم کام کر چکے ہوتے۔ خیر، اب بھی کچھ نہیں بگڑا تمہارے ساتھیوں کو کچھ معلوم ہو گیا تھا، اس لیے تم یہاں نظر آ رہے ہو۔ ورنہ میں راستے ہی میں جس وقت چاہتا، تمہیں ختم کر سکتا تھا۔ اب اور آگے بڑھو"

وہ آگے بڑھے۔ اب وہ ان چھوٹے چھوٹے مکانات کے پاس پہنچ گئے تھے۔ یہاں انہیں آبادی کے آثار نظر آ گئے۔ گھروں میں اور گھروں سے باہر سینکڑوں مرد عورتیں اور بچے مختلف کاموں میں مصروف تھے۔ وہ یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے کہ یہ سب ان کے وطن کے لوگ نہیں تھے، بلکہ دشمن ملک کے تھے۔

وہ آگے بڑھتے رہے۔ چھوٹے چھوٹے مکانات اب ان سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ سامنے انہیں شاندار عمارت دکھائی دی۔

"یہاں میں رہتا ہوں۔ کچھ اور پوچھنا چاہتے ہو؟"

"ہاں، ایک سوال بہت دیر سے میرے دماغ میں ہل چل مچا رہا ہے۔ آخر اس وادی کے اوپر سے ہوائی جہاز تو گزرتے ہوں گے۔ کسی پائلٹ کی نظر کبھی اس وادی اور یہاں رہنے والوں پر نہیں پڑی؟" آفتاب نے پوچھا

"تم نے بہت اچھا سوال کیا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ارد گرد کے پہاڑ بہت اونچے ہیں۔ ان کی زد سے محفوظ رہنے کے لیے جہازوں کو بہت اونچی پرواز کرنی پڑتی ہے۔ دوسرے ہم نے جو مکانات بنائے ہیں وہ بھی سُرخ پتھروں کے ہیں۔ اوپر سے اگر نیچی پرواز کرے

بھی دیکھا جائے تو بھی یہ پہاڑوں کے حصّے ہی نظر آتے ہیں۔ یہ پتا نہیں چلتا کہ یہاں مکانات ہیں۔ دوسرے تم نے دیکھا ہوگا یہاں کے باشندوں کے جسموں پر لباس بھی سُرخ ہیں۔ اس لیے اوپر سے دیکھنے پر کچھ بھی نظر نہیں آتا۔" اب تم لوگ آرام کرو۔ دو دن بعد اس غدّار کی سزا کا دن مقرر ہے۔ اس روز سب لوگ اس عمارت میں جمع ہوں گے۔ یہاں میں تمھیں سُرخ موت کا منظر بھی دکھاؤں گا۔ اب تم لوگ دائیں طرف کے خالی کمرے میں آرام کرسکتے ہو۔ اِدھر اُدھر گھوم پھر بھی سکتے ہو۔ لیکن کوئی غلط حرکت نہ کرنا کیوں کہ تمھیں اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا، البتہ نقصان ضرور پہنچ سکتا ہے۔ تم ہر وقت، ہر جگہ، میری نظروں میں ہو۔" آواز آنی بند ہوگی۔

مایُوسی گُناہ ہے

انھیں جو کمرا آرام کرنے کے لیے دیا گیا تھا وہ کافی بڑا اور آرام دہ تھا۔ ایک بوڑھا آدمی انھیں کھانے پینے کی چیزیں دے گیا۔ ان چیزوں میں ڈبل روٹی آم کا مربّہ اور ڈبّے والی مچھلی شامل تھی۔ پینے کے لیے صاف پانی بھی تھا۔ وہ اطمینان سے کھانا کھانے لگے۔ پورے چوبیس گھنٹے کے بعد انھیں کھانا ملا تھا۔

"میں حیران ہوں کہ یہ لوگ یہاں ڈبل روٹی اور دوسری چیزیں کہاں سے لاتے ہیں؟" منوّر علی خاں بولے۔

"جہاں تک میرا خیال ہے، سرحدی شہر سے لاتے ہوں گے۔" کامران مرزا بولے۔

"لیکن سرحدی شہر تو یہاں سے بہت فاصلے پر ہے، اور پھر روز آتے جاتے انھیں دیکھا بھی تو جا سکتا ہے۔ ان کا راز کیوں نہ کھلا؟" منوّر علی خاں نے کہا۔

"کوئی خفیہ راستہ ضرور ہو گا۔ یا پھر یہ چیزیں یہ لوگ یہیں بنا لیتے ہوں گے۔ جو سائنس دان اتنی حیرت انگیز چیزیں بنا سکتے ہیں، کیا وہ ڈبل روٹی جیسی چیزیں نہیں بنا سکتے۔" کامران مرزا بولے۔

انھیں ہنسی آگئی، کیوں کہ اس پہلو سے تو انھوں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ آفتاب نے سر ہلاتے ہوئے کہا "ضرور یہی بات ہو گی۔ یہ لوگ سب چیزیں یہیں تیار کرتے ہوں گے۔"

کمرے میں تاریکی پھیلتی جا رہی تھی۔ سورج غروب ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ انھوں نے بلب جلانے کے لیے سوئچ کی تلاش میں نظریں دوڑائیں لیکن نہ بلب نظر آیا، نہ سوئچ۔ آفتاب نے ایک کھڑکی کھول کر باہر پتھروں کے مکانات کی طرف نظر ڈالی۔ ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔ پوری وادی پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔

"ارے! یہ لوگ رات کے وقت، روشنی کیوں نہیں کرتے؟" اس کے منھ سے نکلا۔

"تاکہ ہوائی جہازوں کے پائلٹوں کی نظروں میں آنے سے بچے رہیں۔" کامران مرزا نے خیال ظاہر کیا۔

"لیکن... رات کے وقت کیسے اٹھتے بیٹھتے ہوں

گے؟" فرحت نے حیران ہو کر کہا۔

"اندھوں کی طرح۔" آصف بول اٹھا۔

"بھئی دیکھو، یہاں مذاق شروع نہ کر دینا۔ میں سوچنے کے موڈ میں ہوں۔" کامران مرزا نے گھبرا کر کہا۔

"آپ تو ناراض ہو گئے۔ لیجیے، ہم بالکل خاموش ہو جاتے ہیں۔ صرف اتنا بتا دیں کہ اس وقت، ہم اپنے گھر سے کتنے فاصلے پر ہیں؟" آصف نے پوچھا۔

"کیوں؟ تم نے یہ سوال کیوں کیا؟" منوّر علی خاں نے پوچھا۔ فضلو ٹکر ٹکر ان کی شکلیں دیکھ رہا تھا۔

"بس یوں ہی، ذہن میں ایک بات آگئی، میں نے پوچھ لی۔"

"ہم اپنے گھر سے تقریباً دو سو میل دور ہیں۔"

"اب ہمیں اور کچھ نہیں پوچھنا۔ آپ جو چاہیں سوچ سکتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" کامران مرزا نے حیران ہو کر پوچھا۔

"آپ نے ابھی کہا تھا نا کہ آپ، سوچنے کے موڈ میں ہیں۔" آفتاب نے بتایا۔

"اوہ ہاں۔ ٹھیک ہے۔ میں دراصل..."

ان کے الفاظ درمیان میں ہی رہ گئے۔ کمرے

یں خود بخود روشنی ہو گئی تھی۔ چھت میں ایک شیشہ لگا ہوا تھا۔ یہ روشنی اسی میں سے آرہی تھی اور ایک دائرے کی شکل میں کمرے کے فرش پر پڑ رہی تھی۔

"میرا خیال ہے، باہر سے یہ روشنی نظر نہیں آرہی ہوگی۔" کامران مرزا بولے۔

یہ سن کر آفتاب نے کمرے سے نکل کر دروازہ بند کر کے دیکھا۔ واقعی باہر سے کمرا تاریک نظر آرہا تھا وہ اندر آگیا۔

"آپ کا خیال ٹھیک ہے" اس نے کہا۔

"اسی طرح وہ مکان بھی اب اندر سے روشن ہو چکے ہیں، لیکن روشنی باہر سے نظر نہیں آسکتی تاکہ اوپر سے گزرنے والے جہاز کے پائلٹ کو وادی نظر نہ آسکے۔"

"ہوں! بہت زبردست انتظام ہے۔" منور علی خاں نے کہا۔

"آخر کو سائنس دان ہیں۔" کامران مرزا نے ہنس کر کہا۔

"کہیں ہم یہاں پھنس تو نہیں گئے؟ آخر ہم ان

ان لوگوں کا کیسے مقابلہ کرسکیں گے؟ یہ لوگ کیا چاہتے ہیں؟ ہم یہاں سے کیسے نکلیں گے؟ ہمیں تو یہاں سے نکلنے کا راستہ بھی معلوم نہیں۔" منور علی خاں نے پریشان ہو کر کہا۔

"جنگلی درندوں کے شکاری کو اس قدر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ بہت جلد تمام حالات معلوم ہونے والے ہیں۔ اس کے بعد ہی ہم کچھ کرنے کے بارے میں سوچیں گے۔"

یہ کہہ کر کامران مرزا نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور جب ہاتھ باہر نکلا تو اس میں زرد سیال والی شیشی تھی۔ دوسروں نے بھی اپنی جیبیں ٹٹولیں۔ منور علی خاں اور آفتاب کی شیشیاں غائب تھیں۔ شاید وہ نکال لی گئی تھیں۔ کامران مرزا نے بتایا کہ انھوں نے شیشی خفیہ جیب میں رکھی تھی۔ انھوں نے ان سب کو زرد سیال کی جسم پر اس طرح مالش کرنے کی ہدایت کی کہ مالش بھی ہو جائے اور کسی کو پتا بھی نہ چلے۔

"یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ ان مکانوں میں جو مرد، عورتیں اور بچے رہتے ہیں، ان کا یہاں کیا کام ہے؟ وہ سب تو گھریلو قسم کے کام کر رہے تھے۔" آفتاب

نے کہا۔

"ان سے کوئی نہ کوئی کام تو لیا جاتا ہوگا۔"

"یہاں تو زمین دوز دُنیا کی طرح مشینیں وغیرہ بھی نہیں لگی ہیں۔"

"ابھی ہم نے اس پوری وادی کی سیر کہاں کی ہے۔ ہو سکتا ہے، دوسری سمت میں مشینیں لگی ہوں۔"

"کیا آپ ابھی تک یہ بات نہیں سمجھ سکے کہ ان لوگوں کا مقصد کیا ہے؟" آصف نے پوچھا۔

"سمجھ گیا ہوں۔" کامران مرزا نے مسکرا کر کہا۔

"کیا سمجھ گئے ہو؟ بتاتے کیوں نہیں؟" مؤثر علی خاں نے کہا۔

"اگر میں نے تمھیں بتا دیا تو تم پریشان ہو جاؤ گے۔ میں چاہتا ہوں کہ ان حالات میں تم ہرگز پریشان نہ ہو کیوں کہ کوئی کام کر دکھانے کے لیے جاگتا ہوا ذہن ضروری ہے۔"

"یہ کہہ کر آپ نے ہمیں اور بھی پریشان کر دیا ہے" آفتاب بولا۔

"نہیں۔ فکر نہ کرو۔ انشاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ قدرت خود ہمیں یہاں لائی ہے۔"

"لیکن ہم بے یار و مددگار اور نہتے یہاں کیا کر سکتے ہیں جب، کہ ہمارے مقابلے میں عجیب و غریب سائنسی ہتھیار موجود ہیں۔" آصف نے کہا۔

"مایوسی کی باتیں نہ کرو۔ مایوسی گناہ ہے۔ خدا کوئی راستہ ضرور پیدا کرے گا۔"

"انشاء اللہ۔" مؤثر علی خاں بولے۔

اس رات بہت دیر تک انھیں نیند نہ آئی۔ کمرے کا دروازہ باہر سے بند نہیں کیا گیا تھا، نہ دروازے پر کوئی پہرے دار تھا۔ گویا وہ بالکل آزاد تھے۔ کمرے سے نکل کر جہاں چاہتے، جا سکتے تھے۔ ان پر کوئی پابندی نہ تھی۔ اس کے باوجود وہ یوں محسوس کر رہے تھے جیسے وہ سُرخ تیتر موت کی وادی کے قیدی ہوں۔

دوسری صبح انھیں شان دار قسم کا ناشتا دیا گیا۔ آفتاب نے کہا "یہ شخص جارج سے زیادہ مہمان نواز ہے"۔

وہ اس کے جملے پر مسکرائے اور ناشتا کرنے لگے۔ فارغ ہوئے تو وہی آواز آئی "اب تم لوگ میرے پاس آنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

"جناب، ہم آپ کو کس نام سے پکار سکتے ہیں؟"

آفتاب نے پوچھا۔

"یہاں سب لوگ مجھے ماسٹر کہتے ہیں۔"

"بہت بہت شکریہ جناب، کہ آپ نے ہمیں اپنا نام بتانے کی تکلیف گوارا کی۔ لیکن آپ نے مسٹر جارج کو یہ نام کیوں نہیں بتایا تھا؟"

"یہ نام صرف اس وادی کے لوگوں کے لیے مخصوص ہے، اور تم بھی چوں کہ اب یہاں آچکے ہو، اس لیے تمھیں بتانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔"

"بہت خوب! اتنا اور بتا دیں کہ آپ لگتے تو ہیں انگریز... بول اُردو بھی لیتے ہیں۔ یہ کیا بات ہے؟"

"میں بہت سی زبانیں روانی سے بول سکتا ہوں۔ بس اب کوئی سوال نہیں۔"

آواز آنی بند ہو گئی۔ فوراً ہی کمرے کے دروازے پر دس آدمی نمودار ہوئے اور انھوں نے انھیں اٹھنے کا اشارہ کیا۔ ان کے ہاتھوں میں سرخ تیروں والی نلکیاں تھیں۔

"یہ لوگ ہم پر گیس پستول کیوں نہیں تانتے؟" آفتاب نے آصف سے کہا۔

"شاید یہ ڈرتے ہیں کہ کہیں ہم انھیں دیکھ کر

بے ہوش نہ ہو جائیں۔" آصف نے مسکرا کر کہا۔

"بھئی، کم از کم اس وادی میں تو اوٹ پٹانگ باتیں نہ کرو۔" منوّر علی خاں نے کہا۔

"کیوں ابّو، یہاں تو کہیں لکھا نظر نہیں آیا کہ اوٹ پٹانگ باتیں کرنا منع ہے۔" فرحت نے کہا۔

"دیکھا، تمھاری بیٹی بھی ان کے ساتھ رہ کر، انھی جیسی ہو گئی ہے۔" کامران مرزا نے ہنس کر کہا۔

کوئی پندرہ منٹ بعد وہ ایک بہت بڑے ہال میں لائے گئے۔ انھیں ہال کے دروازے کے قریب ہی کھڑا کر دیا گیا۔ انھوں نے دیکھا، ہال کے دونوں طرف کرسیوں پر لوگ بیٹھے ہیں۔ ہال کے آخری سرے پر ایک بہت اُونچے سے چبوترے پر ایک بھاری بھرکم کرسی رکھی تھی، جو سُرخ رنگ کی تھی۔ اس پر کوئی نہیں بیٹھا تھا۔

وہ سوچنے لگے، اب چند لمحوں بعد ہم اس شخص کو دیکھیں گے، جس کا ذکر سُن سُن کر ہمارے کان پک گئے ہیں۔ نہ جانے وہ کیسا انسان ہو گا! کس قدر خوفناک ہو گا، اور کون ہو گا!

ابھی وہ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ کمرے میں سُرخ

روشنی جلنے اور بجھنے لگی ۔ یہ شاید اس کے آنے کا اشارہ تھا۔ ان کے دل دھک دھک کرنے لگے ۔

"اس کی شکل دیکھ کر اُچھل نہ پڑنا ۔" کامران مرزا نے دھیمے لہجے میں کہا ۔

"جی ؟ کیا مطلب ؟ بھلا ہم کیوں اُچھلیں گے ؟"

"تم اسے پہلے بھی کہیں دیکھ چکے ہو ۔" کامران مرزا نے کہا ۔

"کیا !!!" وہ ہکا بکا رہ گئے ۔ آنکھیں یوں پھٹی پڑ رہی تھیں جیسے اب کبھی بند نہ ہوں گی ۔ آخر آفتاب نے کہا :

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ؟ ہم تو اس وادی میں پہلے کبھی نہیں آئے ۔"

"یہ ٹھیک ہے ، مگر اس کے باوجود تم اسے دیکھ چکے ہو ۔"

"حیرت ہے ! آپ نے کبھی اس طرف اشارہ نہیں کیا ۔" آصف نے کہا ۔

"میں نے اس لیے نہیں بتایا کہ تم اُلجھن کا شکار ہو جاتے اور میرے کان کھا جاتے ۔" کامران مرزا مسکرائے ۔

"چلیے ، اب بتا دیں ۔" فرحت نے مسکرا کر کہا ۔

"اب بتانے کی کیا ضرورت ہے ۔ اب وہ خود تم لوگوں کے سامنے آنے والا ہے ۔"

"اُف خدا ! آخر وہ کون ہے ؟" منوّر علی خان نے پوچھا ۔

"زیادہ بے تاب ہونے کی کیا ضرورت ہے ۔ چند لمحوں کی تو بات ہے ۔"

اچانک سُرخ روشنی غائب ہو گئی ، پھر کرسی کے پیچھے ہال کی دیوار میں ایک شگاف پیدا ہوا اور دوسرے ہی لمحے کرسیوں پر بیٹھے ہوئے سب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے ۔ وہ دروازے میں نمودار ہو گیا تھا ، اور اب کرسی کی طرف بڑھ رہا تھا ۔ وہ لمبا تڑنگا اور بھاری بھر کم تھا ۔ لباس سر سے پیر تک سرخ رنگ کا تھا ، اور آنکھیں شعلے برساتی معلوم ہو رہی تھیں ۔ اس کے چہرے کا رنگ بھی سُرخ تھا ۔ بس وہ کوئی سُرخ بھوت معلوم ہوتا تھا ۔

اچانک انہیں کامران مرزا کی بات یاد آئی ۔ وہ اسے دیکھنے میں اس قدر محو ہو گئے

تھے کہ اس بات کو بالکل ہی بھول گئے تھے۔
اسے دیکھ کر وہ بالکل بھی نہیں اُچھلے۔۔
انھوں نے اس شخص کو پہلے کہیں نہیں دیکھا تھا۔

توکیا کامران مرزا کا اندازہ غلط تھا؟

خوفناک فیصلہ

"ابا جان! یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں؟ ہم تو اس شخص کو بالکل بھی نہیں جانتے" آفتاب نے کہا۔

"اور تم لوگوں کا کیا خیال ہے؟" کامران مرزا نے دوسروں سے پوچھا۔

"ہمارا بھی یہی خیال ہے"

"افسوس! میرا اندازہ غلط تھا۔ خیر، کوئی بات نہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے"

ماسٹر اب کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔ انھیں یوں لگا جیسے وہ کسی شہنشاہ کے دربار میں مجرموں کی طرح کھڑے ہوں۔ ماسٹر کے دائیں بائیں دو نوجوان کھڑے تھے جن کے ہاتھوں میں غلیل کی قسم کے دو ہتھیار تھے وہ سب اس طرح باادب بیٹھے تھے، جیسے کسی معمولی سی حرکت سے بھی انھیں پھانسی کا حکم سنایا جا سکتا ہے۔

”تو یہ ہمارے نئے قیدی ہیں“ ماسٹر کی آواز ان کے کانوں میں آئی۔ یہ وہی آواز تھی جسے وہ اس سے پہلے کئی بار سن چکے تھے۔

ان قیدیوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی وجہ سے ہمارا ایک اڈّا ختم ہو گیا۔ اس اڈّے کے تباہ ہونے کی وجہ سے پورے پروگرام میں تبدیلی کرنی پڑی، ورنہ اس وقت تک ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے ہوتے۔“

”معاف کیجیے گا! کیا اس ایک اڈّے کے بغیر کام نہیں چل سکتا؟“ ایک شخص نے کھڑے ہو کر کہا۔

”نہیں۔ تباہ ہونے والا اڈّا سب سے اہم تھا۔ اگر وہ اس وقت موجود ہوتا تو اس ماہ کی بارہ تاریخ کا اعلان کر دیا جاتا۔ تمام اڈّے اس تاریخ کو حرکت میں آ جاتے اور پوری دنیا میں ایک ہی وقت میں ہم کامیاب ہو جاتے۔“

”اب کیا ہو گا؟“ اسی شخص نے سوال کیا۔

”فکر کی کوئی بات نہیں۔ اس اڈّے کے بجائے ایک نیا اڈّا تیار ہو رہا ہے۔“

”کیا یہ اسی جگہ بنایا جا رہا ہے؟“

”نہیں۔ جگہ بدل دی گئی ہے۔“ ماسٹر نے کہا۔

”بہت خوب! اس کا مطلب ہے کہ اب ہمیں چند ماہ انتظار کرنا ہو گا اور یہ سب کچھ ان لوگوں کی بدولت ہوا۔“ اسی شخص نے غصے سے کہا۔

”ان سے زیادہ قصور اس غدّار کا ہے جس نے لیشوما کو فرار ہونے میں مدد دی۔ اسے کل سُرخ موت کے حوالے کیا جائے گا۔“

”اور ان لوگوں کا کیا کرنا ہے؟“

”انھیں کچھ دن زندہ رکھا جائے گا تاکہ یہ دیکھ لیں کہ ان کی دخل اندازی کے باوجود ہم کامیاب ہو گئے ہیں۔“

یہ کہہ کر ماسٹر کامران مرزا کی طرف مڑا اور بولا:

”تم حیران ہو گے کہ یہ چکّر کیا ہے۔ میں تمھاری یہ اُلجھن ختم کیے دیتا ہوں۔“

”ہمارے لیے یہ کوئی اُلجھن کی بات نہیں۔“ کامران مرزا نے کہا۔

”کیا مطلب؟ میرا خیال ہے، اس راز کے بارے میں میرے اور میرے ساتھیوں کے سوا کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ ہاں اس غدّار نے لیشوما کو بتا دیا تھا۔ دراصل ہم یہ

نہیں جانتے تھے کہ وہ افریقی زبان جانتا ہے۔ اُس نے ہماری اسی بے خبری سے فائدہ اُٹھایا۔"

"ٹھیک ہے۔ اس کے باوجود میں جانتا ہوں کہ تم لوگوں کے ارادے کیا ہیں۔"

"تم کیسے جانتے ہو؟" ماسٹر نے گرج کر کہا۔

"بس جانتا ہوں۔ اللہ نے مجھے عقل دی ہے۔ بلکہ میں تو یہ بھی جانتا ہوں کہ تم لوگ اس پروگرام پر مدّتوں سے سوچ رہے تھے۔ پھر پروفیسر جیلانی کے جہاز کو آگ لگ گئی۔ وہ پیراشوٹ کے ذریعے جہاز سے کود گیا اتفاق سے وہ اس وادی میں اُترا۔ یہاں سے وہ کسی نہ کسی طرح بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے اس وادی پر ایک مضمون لکھ مارا۔ تم لوگوں کی نظروں سے وہ مضمون گزرا اور تم نے اس وادی کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنا لیا۔ ہیڈ کوارٹر بننے کے بعد تمھارا پروگرام شروع ہو گیا۔"

"ٹھیک ہے۔ لیکن تم نے بتایا نہیں کہ ہمارا منصوبہ کیا ہے؟" ماسٹر نے غرّا کر کہا۔

"بہت خوف ناک، اتنا کہ جو بھی سن لے، اس کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ تم تمام اسلامی ملکوں پر

قبضہ کرنا چاہتے ہو۔ ایک دن مقررہ وقت پر ہر اڈّے سے تمھارے لوگ گیس پستولوں سے مسلّح ہو کر ان ملکوں پر ہلّا بول دیں گے۔ ان پستولوں کے آگے کسی کی کیا چلے گی۔ جو بھی سامنے آنے کی کوشش کرے گا، ڈھیر ہو جائے گا۔ جوشیلے مسلمان دھڑا دھڑ موت کے منھ میں جا گریں گے اور اس طرح تمام اسلامی ملک ایک ہی وقت میں تمھارے قبضے میں آ جائیں گے۔ پھر تم اسلام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکو گے۔ تم لوگ مسلمانوں کے دشمن ہو اور انھیں صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہتے ہو۔ لیکن کان کھول کر سن لو۔ اسلام رہتی دنیا تک زندہ رہے گا۔ خدا نے خود اس کی حفاظت کا ذمّہ لیا ہے۔ تمھارے ناپاک ارادے کبھی پورے نہ ہوں گے۔"

کامران مرزا کی تقریر سن کر منوّر علی خاں اور بچے سنّاٹے میں آ گئے۔ اتنا بڑا منصوبہ! اتنا خوف ناک منصوبہ! انھوں نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ یہ لوگ اس حد تک بھی جا سکتے ہیں۔

"تم واقعی بہت ذہین ہو۔ تمھیں زیادہ دیر زندہ رکھنا ٹھیک نہیں۔ مگر میں ان سب لوگوں کے سامنے

یہ کہہ چکا ہوں کہ اس منصوبے پر عمل کرنے کے بعد ہی تمہیں موت کے گھاٹ اتارا جائے گا۔

"اب تم لوگ جا سکتے ہو۔ کل دربارِ عام ہوگا۔ تم لوگ بھی بلائے جاؤ گے اور تمھیں اس غدّار کا انجام دکھایا جائے گا۔ تم دیکھو گے کہ سُرخ موت کیا ہے۔"

غدّار کو سزا دینے کے لیے وادی کے میدانی علاقے کو چُنا گیا تھا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں سُرخ موت کے درخت لگے تھے۔ ان درختوں پر گوند جما ہوا تھا۔

جس وقت انھیں لایا گیا، تمام مرد، عورتیں اور بچے وہاں دائرے کی شکل میں جمع ہو چکے تھے۔ ایک جگہ ماسٹر کی کرسی رکھی گئی تھی۔ انھیں کرسی کے بائیں طرف کھڑا کر دیا گیا۔ دائرے کے بیچوں بیچ ایک جگہ لوہے کے کانٹوں کا ڈھیر نظر آرہا تھا۔

اسی وقت زور زور سے بگل بجنے لگا۔ یہ بگل ایک شخص، ایک مکان کی چھت پر کھڑا ہوا بجا رہا تھا۔ انھوں نے چونک کر دیکھا۔

ماسٹر اپنے آدمیوں میں گھرا دائرے کی طرف آرہا تھا

بگل شاید اسی کی آمد کے سلسلے میں بجایا گیا تھا۔ جوں ہی وہ دائرے کے پاس آیا، سب اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

ماسٹر نے ایک نظر لوگوں پر ڈالی اور پھر دائرے کو دیکھنے لگا۔ دائرے میں ایک جگہ انھیں بینڈ والے بھی نظر آئے۔ ماسٹر نے پورے دائرے کو بغور دیکھنے کے بعد ہاتھ اوپر اٹھا دیا۔ اس کے ساتھ ہی بگل کی آواز بند ہو گئی۔ ہر طرف موت کا سناٹا طاری ہو گیا۔ چند لمحوں بعد ماسٹر کی آواز گونجی:

"غدّار کو پیش کیا جائے۔"

دائرے میں سے پانچ آدمی نکل کر ایک مکان میں گھس گئے۔ تین منٹ بعد وہ ایک شخص کو ہاتھوں پر اٹھائے دائرے کی طرف آتے نظر آئے۔ یہ شخص زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا اور بہت بوڑھا تھا۔ ابھی تک وہ اس کی شکل نہیں دیکھ سکے تھے۔

اس شخص کو دائرے کے درمیان میں کھڑا کر دیا گیا اور زنجیریں اتار دی گئیں۔

"اس کا منھ میری طرف کرو۔" ماسٹر نے کہا۔

اس کا چہرہ ماسٹر کی طرف کر دیا گیا۔ جوں ہی کامران مرزا کی نظر اس پر پڑی، وہ اُچھل پڑے۔ ان کی آنکھیں

حیرت سے پھیل گئیں۔ بے اختیار ان کے منھ سے نکلا:
"ارے! یہ تو پروفیسر چنگیزی ہیں۔ ہمارے ملک کے سب سے بڑے سائنس دان، جنھیں آج سے تین سال پہلے مردہ سمجھ لیا گیا تھا کیوں کہ ان کی تجربہ گاہ ایک دھماکے سے اُڑ گئی تھی۔ تجربہ گاہ کے ملبے سے ایک لاش کے ٹکڑے ملے تھے جنھیں پروفیسر کی لاش سمجھا گیا تھا۔ مگر یہ تو زندہ ہیں۔ اُف میرے خدا! تو ان لوگوں نے انھیں اغوا کیا تھا۔ ملبے سے ملنے والی لاش کے ٹکڑے کسی اور بدنصیب کے ہوں گے۔"
"ہاں۔ انھیں ہم نے اغوا کیا تھا۔ انھی دنوں ہمارا ایک ساتھی مر گیا تھا۔ ہم نے اس کے مردہ جسم کو پروفیسر کے کپڑے پہنا دیے اور تجربہ گاہ کو بم سے اُڑا دیا۔" ماسٹر نے بتایا۔
"کیا ان سے مجھے بات کرنے کی اجازت ہے؟"
"ذرا ٹھہرو۔ میں اسے نزدیک بلاتا ہوں" اس نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ وہ پروفیسر کو پکڑ کر ان کے قریب لے آئے۔
"پروفیسر صاحب، کیا آپ مجھے جانتے ہیں؟" کامران مرزا نے پوچھا۔

پروفیسر نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ چند لمحے تکتے رہے، پھر انکار میں سر ہلا کر بولے "نہیں۔ میں نہیں جانتا۔"
"یشوما کو آپ نے بھاگنے میں مدد دی تھی نا؟" کامران مرزا نے پوچھا۔
"ہاں۔ مجھے اُسی جرم کی سزا مل رہی ہے، اور آج میری زندگی کا آخری دن ہے۔"
"یہ کسی کو معلوم نہیں کہ اس کی زندگی کا آخری دن کون سا ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ابھی آپ کتنے دن اور جیتے ہیں۔ بہرحال، آپ نے یشوما سے یہ کیوں کہا تھا کہ اس مہم پر صرف دو آدمی روانہ کیے جا سکتے ہیں؟" کامران مرزا نے پوچھا۔
"اوہ! تو وہ میرے ملک تک پہنچ گیا تھا۔" پروفیسر نے کہا۔
"ہاں، وہ وہاں تک پہنچ گیا تھا۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ بہرحال، اسی وجہ سے ہم یہاں نظر آ رہے ہیں۔"
"میں سمجھ گیا۔ تو تم دونوں انسپکٹر جمشید اور کامران مرزا ہو، اور یہ تمھارے بچے ہیں۔ اس کا مطلب

یہ ہے کہ میری قربانی رائیگاں نہیں گئی۔"

"آپ نے جو کارنامہ انجام دیا ہے، اسے سنہری لفظوں میں لکھا جائے گا۔ میں کامران مرزا ضرور ہوں لیکن ہمارے ساتھ انسپکٹر جمشید نہ آ سکے۔ دراصل کیشوما سیدھا ہم سے آ ٹکرایا تھا، اور وقت کی کمی کی وجہ سے انسپکٹر جمشید کو اطلاع نہیں دی جا سکی۔ یہ میرے دوست منوّر علی خاں ہیں۔ میرے اس مُہم کے ساتھی۔"

"میرا خیال ہے وزیرِ داخلہ کو بھی حالات معلوم ہو گئے ہوں گے۔"

"جی ہاں۔ وہ پوری طرح باخبر ہیں۔"

"بہت خوب! اب مجھے اپنے مرنے کا کوئی دُکھ نہ ہوگا۔"

"آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ نے ہمارے نام کیوں تجویز کیے تھے، جب کہ آپ مجھے جانتے تک نہیں؟"

"بے شک، میں نے آج سے پہلے تمھیں دیکھا نہیں تھا، لیکن تمھارے اور انسپکٹر جمشید کے اور تم دونوں کے بچّوں کے تمام کارناموں کا حال اخبارات میں بچّوں کی طرح شوق سے پڑھا ہے۔ بلکہ میں نے تو ان اخبارات

کی ایک فائل بنا لی تھی اور فرصت کے اوقات میں اس فائل کو اتنے شوق سے پڑھا کرتا تھا جس طرح دوسرے لوگ ناول پڑھتے ہیں۔"

"میں سمجھ گیا۔ میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

"کچھ بھی نہیں۔ میرا خیال چھوڑ دو۔ اسلامی ملکوں کے بارے میں سوچو۔" پروفیسر چنگیزی نے اداس انداز میں کہا۔

"بس! اب اسے کانٹوں کے قریب لے جاؤ۔" ماسٹر نے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔

"خدا حافظ۔" پروفیسر کے منہ سے نکلا

"خدا حافظ۔" ان سب نے کہا۔ اس وقت انھیں اپنے دل ڈوبتے محسوس ہوئے۔ ان کا جی چاہا، وہ پروفیسر کے لیے پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ لیکن یہ رونے کا مقام نہ تھا۔ عقل و ہوش کا مقام تھا۔ کچھ سوچنے اور کرنے کا مقام تھا۔

"اب پروفیسر کے ساتھ کیا کیا جائے گا؟" کامران مرزا نے پوچھا۔

"اسے ان کانٹوں پر دھکیل دیا جائے گا۔ لوہے کے ان کانٹوں پر زہر لگا ہوا ہے۔"

"تم انھیں یہ سزا کیوں دے رہے ہو؟" کامران مرزا نے پوچھا۔

"اس نے ہم سے غدّاری کی ہے۔ ہمارا راز فاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی وجہ سے ہمارا ایک اڈّا تباہ ہوا ہے۔"

"سنو! تم لوگ یہ سب کچھ اپنے ملک کے لیے کر رہے ہو پروفیسر نے یہ سب کچھ اپنے ملک کے لیے کیا ہے۔ اور پھر وہ تمھارے ساتھ اپنی مرضی سے نہیں آیا تھا۔ اسے تم نے اِغوا کیا تھا۔ تمھاری مرضی پر چلنا غدّاری کس طرح ہو سکتی ہے؟"

"یہ باتیں بے سود ہیں۔ ہمارا فیصلہ اٹل ہے۔ پروفیسر کو سُرخ موت کے حوالے ضرور کیا جائے گا۔"

"ٹھہرو! میں ایک تجویز پیش کرتا ہوں۔ تم پروفیسر کے بجائے مجھے کانٹوں پر لٹا دو۔"

"کیا...! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ میں نے آج تک اس سے زیادہ عجیب خواہش نہیں سنی۔" ماسٹر نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔

اور وہی کیا، کامران مرزا کے الفاظ سن کر تو سبھی دنگ رہ گئے تھے۔ آفتاب نے انھیں اس طرح گھور کر دیکھا

جیسے وہ پاگل ہو گئے ہوں۔

"میں ہوش میں ہوں۔ پاگل نہیں ہوں۔" کامران مرزا مسکرائے۔

"ہوں۔ میرا خیال ہے، تمھاری خواہش پوری کر دینے میں کوئی حرج نہیں۔" ماسٹر نے کہا۔

یہ سن کر آفتاب، آصف اور فرحت تھرّا اٹھے منوّر علی خاں بھی پریشان ہو گئے۔ انھوں نے گھبرا کر کہا۔

"کامران مرزا! یہ تم کیا کر رہے ہو؟ خدا کے لیے ہوش میں آؤ۔"

"تو کیا تم چاہتے ہو، میں پروفیسر کو مر جانے دوں؟ ملک کے لیے مجھ سے زیادہ پروفیسر ضروری ہے۔" کامران مرزا نے کہا۔

منوّر علی خاں کے منھ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا۔ سب سکتے کی حالت میں ان کو دیکھنے لگے۔ دوسری طرف ماسٹر نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ وہ پروفیسر کو واپس لے گئے۔ پروفیسر حیران ہو کر ان سب کو دیکھنے لگا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ کامران مرزا نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ جب اُسے بتایا گیا تو وہ ہکا بکا رہ گیا۔

"میں نے تم سے زیادہ بہادر انسان آج تک نہیں دیکھا" پروفیسر نے کہا۔

"اس وقت انسپکٹر جمشید یہاں ہوتے تو مجھے یقین ہے وہ بھی بالکل یہی فیصلہ کرتے" کامران مرزا نے مسکرا کر کہا۔

"اور تم اس حالت میں بھی مسکرانے کا حوصلہ رکھتے ہو" پروفیسر نے کہا۔

"ہاں ۔ اسی کا نام تو زندگی ہے۔"

"لیکن میں تمھیں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔ میں بہت بوڑھا ہو چکا ہوں۔ آج نہیں تو کل مر جاؤں گا تمھیں ابھی زندہ رہنا چاہیے۔ ملک و قوم کے لیے۔ ملک کے دشمنوں کو ختم کرنے کے لیے۔"

"اس کام کے لیے اور بہت لوگ موجود ہیں۔ اب میرا فیصلہ نہیں بدل سکتا۔"

تیار ہو جاؤ۔ بہت وقت ضائع ہو چکا۔"

"مجھے کانٹوں پر کتنے آدمی دھکیلیں گے؟" کامران مرزا نے پوچھا۔

"دس آدمی" ماسٹر نے بغیر سوچے سمجھے کہا۔

"اگر تم چاہو تو اس تعداد میں اضافہ کر سکتے ہو۔"

ماسٹر کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اس نے کہا "کیوں؟

تم یہ کیوں کہہ رہے ہو؟"

"سیدھی سی بات ہے۔ جب ایک شخص کو موت کے منھ میں دھکیلا جاتا ہے تو وہ خود کو بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تمھارے دس آدمی مجھے دھکیلنے میں ناکام ہو جائیں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ایک اور دس کا کیا مقابلہ؟"

بے فکر رہو۔ یہی کافی ہوں گے۔"

اور اگر یہ ناکام ہو گئے؟"

"تو میں ان کو معاف نہیں کروں گا۔ البتہ تمھیں ضرور کچھ دنوں کے لیے زندگی مل جائے گی۔"

"چلو، مجھے منظور ہے"

یہ کہہ کر کامران مرزا کانٹوں کے ڈھیر کی طرف چلنے لگے۔ دس آدمی اُن کے پیچھے قدم بڑھا رہے تھے۔

آخری معرکے

وہ سب بُت بنے کامران مرزا کو کانٹوں کے ڈھیر کی طرف بڑھتے دیکھ رہے تھے۔ انھیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہے ہوں۔ ایک انسان کا یہ رُوپ انھوں نے زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ وہ کتنے اطمینان سے موت کے خوفناک منُھ کی طرف جا رہے تھے۔ اس پر انھیں کسی نے مجبور نہیں کیا تھا۔ یہ سب تو انھوں نے اپنی مرضی سے قبول کیا تھا۔

خود ماسٹر کی آنکھیں بھی حیرت کے مارے پھٹی پڑ رہی تھیں۔ شاید اس نے بھی اپنی زندگی میں ایسا انسان نہیں دیکھا تھا۔ منوّر علی خاں، آفتاب، آصف، فرحت اور فضلو کا بُرا حال تھا۔ ان کے دل دھک دھک کر رہے تھے۔

اچانک کامران مرزا کانٹوں کے پاس پہنچ کر رُک گئے

اور ان کی طرف مڑے۔ منوّر علی خاں کی نظریں ان سے ٹکرائیں۔ ان کی آنکھوں میں کوئی پیغام تھا... ایک خفیہ پیغام۔ منوّر علی خاں ان کا اشارہ سمجھ گئے تھے انھوں نے جلدی سے پورے دائرے پر ایک نظر ڈالی۔ اس وقت سب لوگ تماشا دیکھنے میں محو تھے کسی کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار نہ تھا۔ یہاں تک کہ ماسٹر کے دائیں بائیں جو محافظ کھڑے تھے، ان کے ہاتھ بھی خالی تھے۔ شاید ان لوگوں نے سوچا تھا کہ اتنے بڑے مجمع میں چند نہتّے آدمی کیا کر سکتے ہیں۔

منوّر علی خاں نے جلدی جلدی حالات کا جائزہ لیا اور بچّوں کو بھی سمجھا دیا کہ دشمن اگرچہ سینکڑوں کی تعداد میں ہیں لیکن کسی کے پاس بھی ہتھیار نہیں ہے۔

انھوں نے دیکھا، کامران مرزا میدان میں تنے کھڑے تھے۔ ان کے چہرے پر ایک پُراسرار مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔ یہ مسکراہٹ ان سے کہہ رہی تھی کہ... میں کچھ کرنے جا رہا ہوں۔ ہوشیار رہو۔ موقع کے منتظر رہو۔

اچانک ماسٹر نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ وہ تیر کی طرح کامران مرزا کی طرف بڑھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ ایک ہی ہلّے میں انھیں کانٹوں میں دھکیل

دبی گئے۔

جُوں ہی وہ ان کے قریب پہنچے، پانچ آدمیوں نے ان کے دائیں بازو کو اور پانچ نے بائیں بازو کو تھام لیا کامران مرزا نے کوئی حرکت نہ کی۔

کھیل بہت دلچسپ ہو چلا تھا۔ دس آدمی کامران مرزا کے دونوں بازو تھامے انھیں کانٹوں کے ڈھیر کی طرف کھینچنے کی سرتوڑ کوشش کر رہے تھے۔ کانٹوں کا ڈھیر صرف ایک گز کے فاصلے پر تھا۔ کامران مرزا کی کمر کانٹوں کی طرف اور منھ اُن کی طرف تھا۔ وہ برابر مسکرائے جا رہے تھے۔ دس کے دس آدمی ایڑی چوٹی کا زور لگانے کے باوجود ان کو اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہ ہلا سکے تھے۔ وہ چٹان کی طرح جمے کھڑے تھے۔ یہ دیکھ کر ماسٹر کے غصے کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس نے پوری قوت سے چلّا کر کہا۔ "میں تم لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا، اگر تم اسے کانٹوں کے ڈھیر پہ نہ پھینک سکے۔"

اچانک سب کی سانسیں رُکی کی رُکی رہ گئیں۔ آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ منوّر علی خاں، آفتاب آصف، فرحت اور فضلو کے رنگ اڑ گئے۔ وہ تھرتھر

کانپنے لگی۔

کامران مرزا کے پاؤں اُکھڑ گئے تھے۔ وہ کانٹوں کی طرف گھسٹ رہے تھے۔

یہ دیکھ کر ان آدمیوں نے خوشی کا نعرہ لگایا۔ دائرے میں بھی ہل چل سی مچ گئی۔ ہر کوئی واہ وا، بہت خوب پکارنے لگا۔ کامران مرزا اور بچوں کی یہ حالت تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ کامران مرزا انچ انچ کر کے کانٹوں کے ڈھیر سے نزدیک ہوتے چلے جا رہے تھے

منوّر علی خاں نے سوچا، اب کچھ کر گزرنا چاہیے زندگی رہے یا جائے۔ دوست کی جان بچانے کے لیے وہ ہر قدم اٹھانے کے لیے تیار تھے۔ انھوں نے جلدی جلدی بچوں کی طرف دیکھا اور انھیں آنکھوں ہی آنکھوں میں بتایا کہ میں میدان میں کود رہا ہوں۔

اچانک منوّر علی خان رُک گئے۔ انھوں نے سوچا، وہ تو دراصل کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ کامران مرزا نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ دس آدمی مل کر انھیں کانٹوں میں نہیں دھکیل سکیں گے۔ اب اگر وہ کامران مرزا کی مدد کے لیے میدان میں کودتے تو دوسری طرف سے بیسیوں آدمی میدان میں اتر سکتے تھے۔ اس خیال کے ساتھ ہی وہ

رک گئے ۔

ڈرتے ڈرتے انھوں نے کامران مرزا کی طرف دیکھا ۔ وہ ابھی تک گھسٹ رہے تھے اور کانٹوں کے ڈھیر سے صرف آدھ گز دور رہ گئے تھے ۔

اچانک فضا میں ایک چیخ بلند ہوئی ۔ خوف کے مارے مُنوّر علی خاں اور بچوں نے آنکھیں بند کرلیں ۔ لیکن فضلو کی آواز سن کر وہ چونک اٹھے ۔ فضلو کے منھ سے نکلا تھا :

" وہ مارا ! "

انھوں نے گھبرا کر میدان کی طرف دیکھا ۔ یہ منظر ان کی زندگی کا سب سے عجیب منظر تھا ۔ کامران مرزا کانٹوں کے ڈھیر سے آدھ گز کے فاصلے پر کھڑے تھے لیکن انھیں کھینچنے والوں کی تعداد اب دس نہیں رہی تھی ۔ وہ اب نو تھے ۔ ایک، کانٹوں پر جا گرا تھا ۔

اور اسی لمحے انھوں نے دیکھا ۔ سُرخ موت کو، جس کا ذکر سن سن کر وہ تنگ آچکے تھے ۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اس حالت میں سرخ موت کا نظارہ کریں گے ۔ خود دشمن کا ایک آدمی سُرخ موت کا شکار بن رہا تھا ۔

اُف خدایا! وہ سکتے کی حالت میں کھڑے رہ گئے ۔ کانٹوں پر گرنے والے کے جسم کے تمام مساموں سے خون ننھی ننھی دھاروں کی صورت میں نکل رہا تھا ۔ یہ دھاریں کئی فٹ اونچی تھیں ۔ بس یوں لگتا تھا جیسے باریک سوراخوں والی کسی چھلنی میں سے خون چھن رہا ہو ۔

یہ منظر وہ دم بخود ہو کر دیکھ رہے تھے ۔ ان میں کامران بھی تھے ۔ وہ نو آدمی بھی تھے جو انھیں دھکیلتے رہے تھے ۔ اس وقت وہ بھی ساکت کھڑے تھے ۔ چند لمحوں کے لیے وہ بھول گئے تھے کہ ان کے ذمّے کیا کام لگایا گیا ہے ۔ وہ بھی اس وقت اپنے دس آدمیوں کا انجام دیکھنے میں محو تھے ۔ غرض ہر شخص دنیا سے بے خبر اس منظر کو دیکھ رہا تھا ۔ انھوں نے آج تک کسی شخص کو اس طرح مرتے نہیں دیکھا تھا ۔

پورے تیس سکنڈ تک خون کی دھاریں اُبھرتی رہیں اس کے بعد آہستہ آہستہ ختم ہو گئیں ۔ کانٹوں پر اب صرف خون سے تر کپڑوں میں ہڈیوں کا ڈھانچا رہ گیا تھا ۔

اور اب وہ سمجھے، کامران مرزا نے دراصل چال چلی تھی ۔ وہ اپنی مرضی سے پیچھے ہٹتے چلے گئے تھے ۔ دشمن یہ سمجھا کہ وہ کامیاب ہو رہے ہیں ۔ پیچھے ہٹتے ہٹتے

اچانک انھوں نے ایک بازو کو جھٹکا دیا تھا اور اس جھٹکے سے وہ آدمی کانٹوں پر جاگرا تھا۔

نو آدمی ابھی تک ان کے بازو پکڑے کھڑے تھے شاید وہ سوچ رہے تھے کہ اب کیا کریں! آخر کار کامران مرزا نے کہا:

"چلو، پھر شروع کرو زور لگانا۔ جس شخص کو کانٹوں پر گرنا منظور ہے وہ زور لگائے۔"

انھوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے انھیں دیکھتے رہے۔

"چلو۔ پھر کوشش کرو۔" ماسٹر نے غرّا کر کہا۔

ایک بار پھر وہی رسّا کشی شروع ہو گئی۔ کامران مرزا اپنی جگہ پر جونک کی طرح جمے کھڑے تھے اور نو آدمی اپنا پورا زور لگا رہے تھے۔ اب وہ پوری طرح ہوشیار تھے اور انھوں نے کامران مرزا کے بازو پوری قوت سے پکڑ رکھے تھے۔

اچانک کامران مرزا نے ایک بار پھر اپنے بازو کو ایک زور دار جھٹکا مارا۔ لیکن اس مرتبہ انھوں نے کانٹوں کے ڈھیر کے دوسری طرف جھٹکا دیا تھا دو آدمی لڑھکنیاں کھاتے ہوئے دور تک چلے گئے

اور ان میں دوبارہ اٹھنے کی ہمّت نہ رہی۔ وہ دم سادھے لیٹے رہ گئے۔

اب مقابلے میں صرف سات آدمی رہ گئے تھے۔ وہ بھلا کیا انھیں کانٹوں کی طرف دھکیلتے۔ انھیں تو خود اپنی موت نظر آنے لگی تھی۔ کامران مرزا نے زور لگایا اور انھیں کھینچتے ہوئے کانٹوں کے ڈھیر کی طرف لے چلے۔ یہ دیکھ کر ان ساتوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ بوکھلاہٹ کے عالم میں انھوں نے کامران مرزا کے بازو چھوڑ دیئے اور ان سے دور ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ انھیں اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے کسی جن کو دیکھ لیا ہو۔

اچانک ایک اور حیرت کا پہاڑ ان پر ٹوٹا۔ ان سب کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آ سکتی تھی۔

کامران مرزا نے آگے بڑھ کر کانٹوں بھری ایک شاخ دونوں ہاتھوں میں اُٹھالی تھی۔ اس کو ہاتھ میں لے کر وہ ان سات آدمیوں کی طرف لپکے جو ان کے بازو چھوڑ کر کچھ فاصلے پر کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ خوف زدہ ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ بساط الٹ گئی تھی۔ اسی وقت کامران مرزا چلائے:

"منوّر علی خاں! دیکھتے کیا ہو۔ آگے بڑھ کر ایک

شاخ اٹھا لو۔"

منوّر علی خاں، بجلی کی سی تیزی سے دائرے میں سے نکلے اور چھلانگیں لگاتے ہوئے ان کے پاس پہنچ گئے۔ دوسرے ہی لمحے وہ بھی ایک شاخ اٹھا چکے تھے۔

"ان پر سرخ تیروں کی بوچھاڑ کر دو۔" ماسٹر نے حلق پھاڑ کر کہا۔

دائرے میں ہل چل مچ چکی تھی۔ اچانک دشمنوں نے اپنی جیبوں سے تیر چھوڑنے والی نلکیاں نکال نکال کر تیر چلانے شروع کر دیئے۔ اس عرصے میں آفتاب، آصف اور فرحت بھی کامران مرزا اور منوّر علی خان کے پاس پہنچ چکے تھے۔ وہ گھبرا گئے۔ سیکڑوں ننھے ننھے سرخ تیر ان کی طرف لپکنے لگے۔ بیسیوں تیر ان کے جسموں سے ٹکرائے۔ اس قسم کا ایک تیر انھوں نے یشوما کے سینے میں گڑا دیکھا تھا۔ اس کے بعد ایک تیر پروفیسر جیلانی کے جسم میں لگا دیکھا تھا، اور ان دونوں کے جسم پتھر کی طرح سخت ہو گئے تھے۔

لیکن اس وقت بیسیوں تیر ان کے جسموں سے ٹکرائے تھے اور وہ صحیح سلامت کھڑے تھے۔ البتہ ایک حیرت انگیز بات انھوں نے یہ دیکھی کہ ان پر

برسنے والے تیر صرف ان کے جسم کے ان حصوں سے ٹکرا رہے تھے جن پر وہ کپڑے پہنے ہوئے تھے چہرے کی سیدھ میں آنے والے تیر بھی اپنا رُخ بدل لیتے تھے۔ یہ بہت عجیب بات تھی۔ منوّر علی خاں، آصف، آفتاب اور فرحت، کا حیرت کے مارے بُرا حال تھا۔ البتہ کامران مرزا مسکرا رہے تھے۔

ان کے لیے تو یہ حیرت انگیز معاملہ تھا ہی، ان کے دشمنوں کے لیے یہ اس صدی کا سب سے زیادہ حیرت انگیز واقعہ تھا۔ ان کے سیکڑوں تیر بے کار جا رہے تھے جب کہ ان کے لیے پانچ تیر کافی تھے۔

ماسٹر کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ پھر جیسے اسے ہوش آ گیا۔ اس نے چلّا کر حکم دیا "بند کرو یہ تیروں کی بارش۔ ان پر گیس پستولوں سے فائر کرو۔"

یہ حکم سن کر کامران مرزا اور ان کے ساتھی مُسکرا دیے وہ جانتے تھے کہ گیس پستول بھی ان کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ تیروں کی بارش ایک دم رک گئی اور گیس پستول جیبوں سے نکل آئے۔ فوراً ہی دھوئیں کی پتلی پتلی لکیریں ان کی طرف اس طرح لپکنے لگیں، جیسے ہزاروں سیاہ ناگ ہوا میں تیرتے ہوئے ان کی طرف بڑھ رہے ہوں۔ اور پھر وہ دھوئیں

کے سفید غبار میں چھپ گئے۔

غبار کی وجہ سے دشمن انھیں اور وہ دشمنوں کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ البتہ دشمن یہ سمجھ رہے تھے کہ کامران مرزا اور ان کے ساتھی غبار میں مردہ پڑے ہوں گے۔

کامران مرزا نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا وہ دبی آواز میں بولے "منور علی خاں، ماسٹر کی طرف بڑھو اور اس پر قابو پا لو"

وہ اندازے سے ماسٹر کی طرف بڑھنے لگے اور غبار چھٹنے سے پہلے اس تک پہنچ گئے۔ اس جگہ غبار قدرے ہلکا تھا۔ کامران مرزا نے آفتاب، آصف اور فرحت کو اشارہ کیا۔ وہ فوراً اشارے کو سمجھ گئے اور ان کی ہدایت پر عمل شروع کر دیا۔

جب غبار چھٹا تو ماسٹر کے آدمی یہ دیکھ رہے تھے کہ ان کا ماسٹر اپنی کرسی سے بندھا ہوا ہے اور کامران مرزا اور ان کے ساتھی کھڑے مسکرا رہے ہیں۔

ماسٹر پاگلوں کی طرح چلا چلا کر کہہ رہا تھا "فوراً مشینوں پر پہنچ جاؤ، اور تمام اڈوں کو حکم دے دو کہ اسی وقت اپنے اپنے ملک پر قبضہ کر لیں"

کامران مرزا اس وقت تک مسکراتے رہے تھے۔ یہ

الفاظ سن کر ان کی مسکراہٹ یک لخت غائب ہو گئی۔ اچانک انھوں نے سوچا، شاید پروفیسر چنگیزی اس سلسلے میں کوئی مدد کر سکیں۔ اس خیال کے ساتھ ہی انھوں نے ادھر اُدھر دیکھا۔ اس پورے ہنگامے کے دوران میں پہلی بار انھیں پروفیسر چنگیزی کا خیال آیا تھا۔ جس وقت انھوں نے پروفیسر کی جگہ کانٹوں کے ڈھیر کی طرف جانے کا فیصلہ کیا تھا تو پروفیسر کو ان کی جگہ کھڑا کر دیا گیا تھا۔

انھوں نے چونک کر اس جگہ دیکھا۔ پروفیسر وہاں نہیں تھے۔ وہ اس خیال سے گھبرا گئے کہ کہیں پروفیسر گیس پستول کا نشانہ تو نہیں بن گئے۔ لیکن زمین پر ان کی لاش بھی دکھائی نہ دی۔ دوسرے ہی لمحے کامران مرزا حیرت زدہ رہ گئے۔ پروفیسر چنگیزی کے ساتھ ساتھ فضلو بھی غائب تھا۔

وہ دم بخود کھڑے تھے۔ ماسٹر کے آدمی پوری قوت سے بھاگتے چلے جا رہے تھے۔ کامران مرزا انھیں نہیں روک سکتے تھے۔ البتہ کانٹوں کی باڑھوں کی وجہ سے وہ ان لوگوں سے محفوظ تھے۔ کوئی ان کے نزدیک آنے کی جرأت نہیں کر رہا تھا بلکہ وہ جس طرف بھی بڑھتے، لوگ بھاگ کھڑے ہوتے

ماسٹر کا حال بُرا تھا۔ وہ غصّے سے پیچ وتاب کھا رہا تھا۔ آفتاب اور آصف نے اُسے پیٹیوں سے باندھ دیا تھا۔ منوّر علی خاں نے اپنے جُوتے کی ایڑی میں سے ننھا سا چاقو نکال کر آفتاب کو دے دیا تھا۔ اس چاقو کی نوک اس وقت ماسٹر کی گدّی کو چھُو رہی تھی۔

ماسٹر کے آدمی اب ان کی نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔ کامران مرزا کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ اس خیال سے ان کے جسم سے جان نکلنے لگی کہ اب تمام اسلامی ملک دشمنوں کے قبضے میں چلے جائیں گے اور ان میں بسنے والے کروڑوں مسلمان موت کا نوالہ بن جائیں گے، جن میں ننھے ننھے بچے بھی ہوں گے، بوڑھے بھی ہوں گے، مرد اور عورتیں بھی ہوں گی۔

ابھی وہ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ کان پھاڑ دینے والا ایک دھماکا ہوا۔ سُرخ پتھروں کے کروڑوں ٹکڑے فضا میں اُچھلے۔ آگ کے شعلے بلند ہوئے۔ اگرچہ یہ سب ان سے بہت فاصلے پر ہوا تھا، پھر بھی پتھروں کے بہت سے ٹکڑے ان تک پہنچ گئے۔ انھوں نے دوڑ دوڑ کر خود کو بچایا۔ اس عالم میں، جب کہ سب لوگ بدحواسی کی حالت میں دوڑ بھاگ رہے تھے، آفتاب پتھروں سے بے پروا چاقو کی نوک ماسٹر

کی گدّی سے لگائے کھڑا رہا۔

پتھروں کی بارش رُکی تو وہ پھر ماسٹر کے قریب آ گئے۔ وادی میں رہنے والے اب ایک مجمعے کی صورت میں ان سے کافی فاصلے پر کھڑے تھے۔ اگر کامران مرزا اور منوّر علی خاں کے ہاتھوں میں اس وقت کانٹوں کی باڑھیں نہ ہوتیں تو یہی لوگ ان کی تکا بوٹی کر ڈالتے۔

"یہ کیا ہوا؟" کامران مرزا نے ماسٹر سے پوچھا۔

"شاید پروفیسر نے سب کچھ تباہ کر دیا۔ میں نے اُسے زندہ رکھ کر غلطی کی تھی۔ وہ ہر راز سے باخبر تھا۔ یہاں گڑ بڑ ہوتے دیکھ کر وہ چپ چاپ نکل گیا اور وہاں پہنچ کر اس نے سب کچھ تباہ کر دیا۔"

"تو کیا پروفیسر ختم ہو گئے ہوں گے؟" کامران مرزا نے پوچھا۔

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔" ماسٹر نے کہا "البتہ وہ لوگ جو مشینوں کی طرف دوڑے جا رہے تھے، ان میں سے شاید ہی کوئی بچا ہو گا۔"

ابھی وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ انھوں نے دو آدمیوں کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ بے تحاشا بھاگ رہے تھے۔ ان کے پیچھے کوئی نہ تھا۔ نزدیک آنے پر انھوں

نے دیکھا، وہ پروفیسر چنگیزی اور فضلو تھے۔

"اوہ! تو فضلو کو پروفیسر چنگیزی اپنے ساتھ لے گئے تھے" کامران مرزا کے منہ سے نکلا۔

وہ قریب پہنچے تو بڑی طرح ہانپ رہے تھے۔ فضلو کے ہاتھ میں ریشم کی ڈوری کا ایک گچھا بھی تھا۔ انھوں نے جلدی جلدی اس گچھے سے ماسٹر کے ہاتھ پیر باندھ دیے

"اب اسے یہاں سے لے چلو اور ہاتھوں میں کانٹے تھامے رہو۔" پروفیسر چنگیزی نے کہا۔

"ہم کہاں جائیں گے؟" منور علی خاں نے پوچھا۔

"اس وادی سے باہر، اپنے ملک میں"

"لیکن کیسے؟"

"اس کے دو طریقے ہیں۔ ایک ہوائی جہاز سے، دوسرے سرنگ کے راستے سے؟"

"سرنگ؟ کیا یہاں سرنگ بھی ہے؟" کامران مرزا نے پوچھا۔

"ہاں۔ اسی کے ذریعے تو میں نے بشوما کو بھگایا تھا!"

"ہم ہوائی جہاز کے ذریعے چلیں گے تاکہ جلد پہنچ سکیں۔" کامران مرزا بولے۔

"مجھے اس جگہ کا علم ہے، جہاں ہوائی جہاز موجود ہے۔

چلو میرے ساتھ۔"

آدھ گھنٹے بعد وہ جہاز میں بیٹھے سرخ پہاڑوں پر پرواز کر رہے تھے۔ ماسٹر ان کے ساتھ بیٹھا تھا۔

"ہم کتنی دیر میں اپنے شہر پہنچ جائیں گے؟" آفتاب نے پوچھا۔

"صرف آدھ گھنٹے میں۔"

"آپ نے یہ نہیں بتایا کہ ہم سرخ تیروں سے کیسے بچ گئے؟" آصف نے پوچھا۔

"سائنس کا مقابلہ سائنس ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت ہم سب جو لباس پہنے ہوئے ہیں، یہ سائنس دانوں نے تیار کیے ہیں۔ ان لباسوں کی خاصیت یہ ہے کہ ہر قسم کی لکڑی کو اپنی طرف اس طرح کھینچتے ہیں جس طرح مقناطیس لوہے کو۔ یہ ایک قسم کی دھات کے تاروں سے بنائے گئے ہیں، جو دھاگوں کی طرح نرم ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ کوئی تیر جسم کے ننگے حصوں سے نہیں ٹکرایا اور لباس سے ٹکرانے والے تیر بھی جسم کی جلد تک نہیں پہنچ سکے۔"

"اوہ! تو یہ بات تھی" فرحت نے حیران ہو کر کہا۔

"ایک بات اور ہے۔ آپ نے کہا تھا کہ اصل مُجرم، یعنی کہ ماسٹر، ہمارا جانا پہچانا ہو گا، لیکن ہم نے تو اُسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔" آفتاب نے کہا۔

"اس شخص کے دو رُوپ ہیں۔ جب میں تمھیں اس کا دوسرا روپ دکھاؤں گا تو تم جان جاؤ گے کہ میں نے غلط نہیں کہا تھا۔"

"آپ ہمیں اس کا دوسرا روپ کب دکھائیں گے؟"

"شہر پہنچ کر" انھوں نے جواب دیا۔

ٹھیک تین گھنٹے بعد وہ وزیرِ داخلہ کے دفتر میں موجود تھے۔ وہاں تمام بڑے بڑے افسر پہنچ چکے تھے۔ اخباری نمایندے بھی آئے ہوئے تھے۔ وہ سب کامران مرزا کی کہانی اس طرح سُن رہے تھے جیسے سند باد جہازی اپنے سفر کا آخری حصّہ سنا رہا ہو یا پھر جیسے الف لیلہ کی کوئی کہانی انھیں سنائی جا رہی ہو۔ اور جب انھوں نے مجرموں کے مقصد کے بارے میں بتایا تو سب لوگ دھک سے رہ گئے۔

کامران مرزا بولے:

"اور اب میں بتاتا ہوں کہ یہ شخص کون ہے۔ در اصل یہ دشمن ملک کا ایجنٹ ہے اور

اب سے کوئی بیس سال پہلے ہمارے ملک میں مہاجر بن کر آیا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا سائنس دان بھی ہے۔ ٹھہریے، میں آپ کو اس کا چہرہ دکھاتا ہوں۔"

یہ کہہ کر کامران مرزا نے اپنے ایک آدمی کو اشارہ کیا۔ وہ اٹھا اور کاغذ میں لپٹی ہوئی کوئی چیز کامران مرزا کی طرف بڑھا دی۔ انھوں نے اُسے کھولا۔ یہ ایک عینک اور مصنوعی بالوں کی ایک وِگ تھی انھوں نے وِگ ماسٹر کے سر پر رکھ کر اس کی آنکھوں پر عینک لگا دی۔

دوسرے ہی لمحے کمرے میں حیرت میں ڈوبی ہوئی چیخیں بلند ہوئیں۔ آفتاب، آصف اور فرحت کا تو بُرا حال تھا۔ ان کے سامنے پروفیسر جیلانی بیٹھا تھا۔ وہی، جس کے سینے میں انھوں نے تیر گڑا دیکھا تھا اور جس کی لاش بعد میں غائب ہو گئی تھی

"اس نے اپنی موت کا ڈراما کھیلا تھا اور کوئی دوا کھا کر اپنے جسم کو سرد کر لیا تھا۔ ساتھ ہی اس نے اپنے کپڑوں کے اوپر ایک سُرخ تیر لگا لیا تھا۔ ہمارے واپس

جانے کے بعد اس کے ملازم نے اسے کوئی دوا سنگھائی اور پھر وہ دونوں خفیہ راستے سے برج موت کی وادی میں پہنچ گئے۔

"خفیہ راستے سے کیا مطلب؟" آفتاب نے پوچھا۔

"اس شہر سے یہ لوگ سرحدی شہر پہنچے۔ اس شہر میں رصد گاہ کے نزدیک ہی خفیہ سرنگ کا راستہ ہے۔"

سب لوگ چپ چاپ اس خوفناک مجرم کو دیکھتے رہے۔ اخباری نمایندے دھڑا دھڑ تصویریں اتار رہے تھے۔ کیمروں کی چکا چوند کر دینے والی روشنیوں نے ان کی آنکھوں کو چندھیا دیا۔

دوسرے دن کے اخبارات نے جب اس کہانی کو شائع کیا تو سارے ملک میں تہلکہ سا مچ گیا۔ کامران مرزا اور ان کے ساتھیوں کو ہر طرف سے مبارک باد کے پیغام موصول ہونے لگے۔ جو لوگ ان سے ذاتی طور پر واقف تھے، وہ گھر مبارک باد دینے کے لیے آنے لگے اور اس طرح آنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔

کامران مرزا مبارک باد دینے والوں سے کہہ رہے تھے "اس مبارک باد کے مستحق تو دراصل یشوبا اور پروفیسر چنگیزی ہیں۔ اصل کام تو انھوں نے کیا ہے۔ اگر یہ دونوں اپنا کام انجام نہ دیتے تو آج دشمن کامیاب ہو چکا ہوتا۔"

عمل کر سکے؟
مظلوم قیدیوں پر کیا گزری؟
پروفیسر جیلانی سے ایک دلچسپ ملاقات۔
"ابھی دشمن کا پہلا قلعہ فتح ہوا ہے۔" کامران مرزا کا بیان۔
"مجھ پر گیس پستول سے فائر کرو۔" کامران مرزا آفتاب کو حکم دیتے ہیں۔
سرخ تیر کی وادی کا راستہ کامران مرزا نے کیسے دریافت کیا؟
راستے میں پیش آنے والے حیرت انگیز واقعات۔
منور علی خاں پہاڑی بچھو سے مقابلہ کرتے ہیں۔
اس تمام منصوبے کے پیچھے کس کا دماغ کام کر رہا تھا؟
یہ سب کچھ جاننے کے لیے "سرخ تیر" کا چوتھا اور آخری حصہ

سرخ تیر کی وادی میں

پڑھیے۔

مطبوعہ فیروز سنز لمیٹڈ لاہور۔ باہتمام عبدالسلام پرنٹر اور پبلشر

دروازہ کھلتا ہے

ٹھیک بارہ بجے ترکیب پر عمل شروع ہوا۔ کامران مرزا کو یقین تھا کہ اس وقت اس زمین دوز دنیا میں ان کے علاوہ سب سو چکے ہیں۔ انھوں نے آفتاب کو اشارہ کیا۔

آفتاب فرش سے اٹھا، جیب سے چابی نکالی اور دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھا۔ سلاخوں والے دروازے میں سے ہاتھ باہر نکال کر چابی تالے میں داخل کرنا آسان کام تھا لیکن اس میں بھی اس نے پوری احتیاط کی۔ ہلکی سی آواز بھی پیدا نہ ہوئی۔ تالا کھلتے ہی اُن کے دل خوشی سے کھل اُٹھے۔ اب وہ اس قید خانے سے باہر نکل سکتے تھے۔ سب اُٹھ کھڑے ہوئے۔

وہ دن میں مزدوروں کا بڑا کمرا دیکھ چکے تھے جس میں وہ رات کے وقت سوتے تھے۔ کامران مرزا نے اپنے ذہن میں یہ بات پہلے ہی بٹھا لی تھی کہ سب کمروں کے دروازے ایک جیسے ہیں، اس لیے گنے بغیر وہ اس ہال یا دوسرے کمروں تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ جب وہ سیر سے واپس آ رہے تھے تو ہر کمرے کا نمبر

ذہن نشین کرتے جا رہے تھے۔

وہ قید خانے سے نکل آئے۔ کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہ تھی کیوں کہ ہر بات وہ پہلے ہی بتا چکے تھے۔ ان کے قدم اُٹھنے لگے۔ وہ سب کامران مرزا کے پیچھے چل رہے تھے۔ برآمدوں کا موڑ مڑتے مڑتے آخر وہ ایک دروازے کے سامنے رک گئے۔ برآمدے میں اب بھی ہلکا بلب روشن تھا اور اس کی مدھم روشنی میں کمرا آدھا تاریک تھا۔ کامران مرزا نے آواز پیدا کیے بغیر دروازے کے بائیں طرف لگا بٹن دبایا۔ دروازہ کھل گیا۔

منوّر علی خاں کے سوا وہ سب اندر داخل ہو گئے۔ ان کے اندر داخل ہونے کے بعد دروازہ بند ہو گیا۔ یہ ایک بہت بڑا ہال تھا۔ انھوں نے دیکھا، اڑھائی سو کے اڑھائی سو مزدور ننگے فرش پر گہری نیند سو رہے ہیں۔ ہونٹوں پر انگلیاں رکھ کر انھوں نے ان لوگوں کو جگانا شروع کیا۔ مزدور ان سب کو دیکھ چکے تھے۔ اس لیے جو بھی جاگتا رہا، پھٹی پھٹی آنکھوں سے انھیں دیکھتا رہا جیسے وہ رحمت کے فرشتے ہوں۔ البتّہ ان کے ہونٹوں سے کوئی آواز نہ نکلی۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ سب جاگ چکے تھے۔ ان میں سب انسپکٹر رمضان بھی شامل تھا۔ کامران مرزا نے اسے اپنے ساتھ لے لیا۔ ٹھیک پندرہ منٹ بعد باہر سے منوّر علی خاں

نے دروازہ کھول دیا۔

وہ دبے پاؤں ہال سے باہر نکلے اور مُردوں کی طرح خاموش، آواز پیدا کیے بغیر کامران مرزا کے پیچھے چل پڑے۔ انھیں اس وقت یوں لگا جیسے کسی قبرستان کے بیچ چل رہے ہوں۔ آخر کامران مرزا ایک دروازے پر رُک گئے۔ ان کے پیچھے دوسرے بھی رُک گئے۔ کمرے کا دروازہ کھولا گیا۔ مزدوروں کو باہر ہی ٹھہرنے کا اشارہ کر کے وہ اندر داخل ہو گئے۔ اس کمرے میں جارج کے دس وفادار ساتھی آرام وہ بستروں پر سو رہے تھے۔ کامران مرزا نے رمضان کو اشاروں میں بتایا کہ ان لوگوں کو باندھنا ہے، اس طرح کہ ان میں سے کسی کے حلق سے ہلکی سی آواز بھی نہ نکل سکے۔ یہ ایک مشکل کام تھا۔ ان کے پاس رسّیاں نہیں تھیں۔ جب رمضان نے اس پریشانی کا اظہار کیا تو کامران مرزا مسکرائے اور انھوں نے اشارے سے بتایا کہ ہم ان چارپائیوں کی رسّیاں استعمال کریں گے جن پر یہ لوگ سو رہے ہیں۔ اس پر رمضان نے پوچھا کہ یہ رسّیاں کیسے کھولی جائیں گی، تو منوّر علی خاں نے اپنے دائیں پاؤں کا جوتا نکالا اور اس کی ایڑی پر زور لگا کر اسے سرکایا۔ وہاں ایک چھوٹا سا خانہ بنا ہوا تھا۔ اس خانے میں ایک ننھا سا چاقو موجود تھا۔ منوّر علی خان نے یہ چاقو نکال لیا۔ اب کامران مرزا نے انھیں ترکیب بتائی۔ جارج کے ہر ساتھی

پر چار چار مزدور مقرر کیے گئے۔ ان کو سمجھایا گیا کہ ایک ایک شخص پر قابو پایا جائے گا لیکن اگر اس دوران میں کسی دوسرے کی آنکھ کھل جائے تو فوراً اس پر بھی قابو پا لیا جائے۔

سب تیاریاں مکمل ہونے کے بعد کامران مرزا، منوّر علی خاں اور رمضان نے پہلے آدمی کو اپنا نشانہ بنایا۔ تینوں کے ہاتھ ایک ساتھ چلے۔ کامران مرزا نے دونوں ہاتھ مضبوطی سے اس کے منھ پر جما دیے۔ منوّر علی خان نے اس کے دونوں بازوؤں کو جکڑ لیا اور رمضان نے ٹانگوں کو۔ اس کی آنکھ کھل گئی تھی اور وہ خود کو آزاد کرانے کے لیے بڑی طرح مچل رہا تھا۔

منوّر علی خاں اپنا چاقو پہلے ہی آفتاب کو دے چکے تھے۔ اس نے آناً فاناً چارپائی کی ادوان ایک طرف سے کاٹی اور اُسے کھولنے لگا۔ اس کے بعد اس رسّی کی مدد سے اسے چارپائی کے ساتھ ہی جکڑ دیا گیا۔ رہ گیا اس کا منھ، تو کامران مرزا نے اسی کی جیب سے رومال نکال کر اس کے منھ میں اس طرح ٹھونسا کہ وہ آواز نہ نکال سکا۔

ایک دشمن پر قابو پایا جا چکا تھا۔ اس کے بعد کامران مرزا اور ان کے ساتھی دوسرے کی طرف بڑھے۔ انھوں نے چاروں مزدوروں کو پرے ہٹایا۔ کیوں کہ مزدور اس کام کو نہیں کر سکتے تھے۔ اب دوسرے کی باری آئی، اسی طرح تیسرے کی۔ کسی کے

پاس رومال نہ نکلا تو اس کے پلنگ کی چادر چاقو سے کاٹ کر کام میں لائی گئی۔ اس طرح تقریباً آدھ گھنٹے میں دس آدمی باندھے جا چکے تھے، اور ابھی چالیس باقی تھے۔ اس کمرے کو باہر سے بند کر کے وہ دوسرے کمرے کی طرف بڑھے، یہاں تک کہ پچاس کے پچاس آدمیوں کو دو گھنٹے کے اندر اندر باندھ لیا گیا۔ اب ان سب کا گرو گھنٹال جارج رہ گیا تھا۔ لیکن وہ اس کے کمرے کو باہر سے نہیں کھول سکتے تھے۔

کامران مرزا نے انھیں ابھی تک یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ جارج سے کیسے نبٹیں گے، اور اس تہ خانے سے باہر کیسے نکلیں گے کیوں کہ اس کا طریقہ تو صرف جارج کو معلوم تھا، اور ظاہر ہے کہ وہ خود تو انھیں بتانے سے رہا۔

تمام لوگوں پر قابو پانے کے بعد کامران مرزا نے انھیں اشارہ کیا کہ اب وہ ان کی اگلی ہدایت پر عمل کریں۔ منوّر علی خاں، آصف، آفتاب اور فرحت مزدوروں کو ساتھ لے کر سیڑھیوں کی طرف چل پڑے۔ اڑھائی سو مزدوروں کا ان سیڑھیوں پر آ جانا مشکل تھا۔ منوّر علی خان نے انھیں خاموشی سے سیڑھیوں پر اور سیڑھیوں کے ساتھ ساتھ فرش پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ ان کے چہرے خوشی سے تمتمائے ہوئے تھے۔ شاید اب آسمان دیکھنا انھیں ممکن نظر آنے لگا تھا۔ ان سب نے منوّر علی